مجلس ادارت

۱۔ پروفیسر نذیر احمد، علی گڈھ   ۲۔ مولانا سید محمد رابع ندوی، لکھنؤ

۳۔ مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی، کلکتہ   ۴۔ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڈھ

۵۔ ضیاء الدین اصلاحی (مرتب)

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے   فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ   ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، فرسٹ فلور شیرستان بلڈنگ

دین محمد وفائی روڈ، بالمقابل ایس ایم آرٹس کالج،

کراچی۔ ۷۴۲۰۰ (پاکستان)۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم صرف منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۳   ماہ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۰۴ء   عدد ۳

فہرست مضامین

☆ ☆ ☆

شذرات

پورے ملک میں گجرات کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے یہیں کی وادیوں میں اذانِ توحید گونجی اور یہ سرزمین ان نفوسِ قدسیہ کا مدفن بنی جنہوں نے عجب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا جمال جہاں آرا دیکھا ہو، علاء الدین خلجی کی فتح گجرات اور ملک کافور کے حملوں سے صدیوں پہلے مسلمان تاجروں کی یہاں نو آبادیاں قایم ہوگئی تھیں اور انہوں نے اپنے اخلاق و کردار کا گہرا اثر ڈالا، اس لیے ہندو راجاؤں نے انہیں مذہبی و معاشرتی رعایتیں دیں اور ان کے رہن سہن، لین دین، طور طریقہ، معاملات کی صفائی، اخلاق کی پاکیزگی اور سچائی کے اثر سے مقامی باشندوں کی بڑی تعداد مسلمان ہوگئی اور کہیں کہیں ان کی آبادی دس ہزار ہوگئی جن میں ان کے اپنے قاضی ہوتے تھے جو ہنر مند کہلاتے تھے، مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں، آلِ مظفر نے احمد آباد شہر آباد کر کے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا اور اپنی علم دوستی اور ادب نوازی سے پورے گجرات کو علم و ادب کا چمنستان بنا دیا، احمد آباد میں کبار علما و مشائخ اور ممتاز شعرا و سخن ور پیدا ہوئے اور باہر سے بھی آئے، سلاطینِ گجرات کے زمانے کی مسجدیں اور درگاہیں ملک کے سیکولرازم کا نشان بنی ہوئی اب تک موجود تھیں۔

احمد آباد میں حضرت پیر محمد شاہ (م ۱۱۶۳ھ) کی درگاہ مرجع خلایق ہے، اس کا کتب خانہ نادر مخطوطات اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ ہے، اس کے ریسرچ سینٹر اور درگاہ ٹرسٹ کے زیر اہتمام سال دو سال کے بعد علمی سمینار ہوا کرتے ہیں، ۱۹۹۵ء سے اس کا دعوت نامہ مجھے بھی برابر مل رہا ہے، اکتوبر ۲۰۰۱ء کے سمینار میں میری شرکت ہوئی تھی جس کے تین ماہ بعد وہاں ہندوستان کو دنیا میں رسوا کرنے والا فساد ہوا جو کلدیپ نیر کے بہ قول بھارتیہ جنتا پارٹی کی اپنی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا اور جسے بھڑکانے میں پارٹی کے اپنے وزیر اعلا کا ایک اہم رول تھا، اسے یاد کر کے اس سال کے سمینار میں دورانِ تقریر احمد آباد کی میئر انیسہ بیگم مرزا صاحبہ رو پڑیں، خیال تھا کہ اب یہ سمینار مدتوں نہ ہو سکے گا لیکن وہاں کے مسلمانوں اور درگاہ کے ٹرسٹیوں کی ہمت کو آفریں ہے کہ ان کی علمی، تعلیمی، قومی، ملی، معاشرتی اور تجارتی سرگرمیاں پھر شروع ہوگئی ہیں ؎

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا   اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

اس سال درگاہ شریف کا سمینار ۲۵؍ تا ۲۷؍ جنوری ۲۰۰۴ء کو اپنی روایتی شان سے ہوا اور اس کا موضوع بھی گجرات کی علمی و ثقافتی وراثت تھا، البتہ ایک سشن ڈاکٹر ضیاء الدین احمد دیسائی اور ایک ولی گجراتی کے لیے مختص تھا، افتتاحی جلسے میں ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کونسلر آقائی جناب جلال تملہ، ممبئی کلچر ہاؤس کے ڈائریکٹر آقائی علی یوسفی، سفیر افغانستان دہلی کے سکریٹری ڈاکٹر اے۔ کے۔ رشید، پروفیسر امیر حسن عابدی اور پروفیسر وارث حسین علوی وغیرہ کی تقریریں ہوئیں اور ٹرسٹ کی کتابوں کی رسم اجرا کی تقریب ہوئی، مقالات کے آٹھ جلسے ہوئے جن میں ۴۵ مقالے پڑھے گئے، مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ دہلی سے پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر علیم اشرف، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، علی گڑھ سے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اعظم گڈھ سے راقم ممبئی سے جناب شمیم طارق، بڑودہ سے ڈاکٹر مقصود احمد، ناگ پور سے پروفیسر سید عبدالرحیم، ڈاکٹر غیاث الرحمن اور مقامی لوگوں میں پروفیسر محبوب حسین عباسی، پروفیسر نثار انصاری، ڈاکٹر جعفر حسین لالی والا، مسز شیرین مہتا، ڈاکٹر بھارتی شیلت، ڈاکٹر پنکج دیسائی، مولانا عبدالاحد تاراپوری اور وفا جون پوری وغیرہ نے مقالے پڑھے، راقم کا ایک مقالہ مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی اور دوسرا ضیاء الدین دیسائی مرحوم پر تھا، سمینار کمیٹی کے تمام ارکان خصوصاً اس کے کنوینر پروفیسر محی الدین ممبئی والا سمینار کی کامیابی پر مبارک باد کے مستحق ہیں، فساد کی تفصیل معلوم کر کے مزید دکھ ہوا، لوٹ مار، قتل و خوں ریزی سے ظالموں کی تسکین نہیں ہوئی تو متعدد مساجد و مقابر بھی مسمار کر ڈالے، کیا یہی درخشاں ہندوستان ہے۔

۲۱/۲۲؍ فروری ۲۰۰۴ء کو ساہتیہ اکادمی کے آڈیٹوریم میں اس کے زیر اہتمام میر انیس و مرزا دبیر پر دو سو سالہ سمینار ہوا، افتتاحی جلسے کی صدارت اکادمی کے صدر، اردو کے مشہور نقاد، پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی، اپنی عالمانہ تقریر میں مرثیے کی ادبی شان بتاتے ہوئے دبیر کے پس پشت ہو جانے اور انیس کے پیش نگاہ رہنے کا ذکر کیا اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے زاویے سے دونوں عظیم اردو شاعروں کے نئے تنقیدی جائزے پر زور دیا، جلسے کا آغاز اکادمی کے سکریٹری مسٹر کے سچدانندن کی خیر مقدمی انگریزی تقریر سے ہوا تھا، دبیریات کے ماہر سید تقی عابدی (ٹورنٹو) نے دبیر کی اہمیت اور ان کی رثائی شاعری کی قدر و قیمت بتاتے ہوئے ان کی جانب سے بے اعتنائی کا شکوہ کیا، پروفیسر سیدہ جعفر (حیدر آباد) کے کلیدی خطبے میں انیس کے استعاراتی نظام

پر سیر حاصل گفتگو کی گئی تھی، جناب شین کاف کے کلمات تشکر پر افتتاحی اجلاس ختم ہوا، مقالات کے پہلے جلسے کی صدارت پروفیسر قمر رئیس (دہلی) نے کی اور رضا علی عابدی (لندن)، صابر ارشاد عثمانی (پاکستان) اور عباس رضا نیر نے علی الترتیب ''ہم انیسیے بھی ہیں اور دبیریے بھی''، ''انیس کے ہم عصر شاعر رومانی دور میں'' اور ''اسٹیج مکالمہ اور دبیر'' کے عنوان سے مقالے پڑھے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے کی اور شمیم طارق ممبئی (مراثی انیس میں رجز)، انیس اشفاق لکھنؤ (مراثی انیس میں دریا کے رنگ)، محمد زماں آزردہ کشمیر (دبیر کے امتیازات)، قمر جہاں بنارس (دبیر کے مرثیوں میں ایپک) کے مقالے ہوئے، تیسرے جلسے کے صدر رضا علی عابدی (لندن) تھے اور مشکور حسین یاد (پاکستان)، شارب ردولوی (دہلی)، اقبال مرزا (لندن) اور رفیعہ شبنم عابدی (ممبئی) نے ان عنوانات ''دبیر اور زبان کی جہات''، ''مراثی دبیر میں مضمون آفرینی کا عمل''، ''شیکسپیر اور انیس کی مماثلت'' اور ''انیس کی ارضیت پسندی'' سے مضامین پڑھے، چوتھے اجلاس کے صدر پروفیسر محمد زماں آزردہ تھے، اسی میں راقم کا مقالہ ''دبیر کی مرثیہ گوئی کے نمایاں پہلو'' پر ہوا، اکثر مقالے اچھے تھے اور ان پر مفید و معنی خیز بحث و گفتگو بھی ہوئی جس میں اکادمی کے صدر کی نکتہ آفرینیاں سننے کے لائق ہوتی تھیں، راقم کے اس خیال پر کہ ''مرثیے میں ضعیف اور ساقط الاعتبار روایتیں اسی طرح شامل ہوگئی ہیں جس طرح فضایل و ترغیبات یا رسول اللہؐ کی ولادت و معجزات میں شامل ہیں''، پروفیسر آزرمی دخت نے اعتراض کیا جس کی تایید پروفیسر نارنگ نے یہ کہہ کر کی کہ ان کو نکالنے کے بعد باقی ہی کیا رہ جائے گا، وقت کی کمی سے مجھے موقع نہیں دیا گیا، میرا جواب یہ ہے کہ جو واقعہ یا روایت بیان کی جائے اسے صحیح ہونا چاہیے، عقاید کو تو اور بھی شک سے خالی ہونا چاہیے، آزردہ صاحب کا یہ ارشاد صحیح نہیں تھا کہ موازنہ انیس و دبیر کی مقبولیت اس وجہ سے ہوئی کہ مولانا شبلی کو ایک ادارہ مل گیا تھا، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ موازنہ کی اشاعت مولانا کی زندگی میں ادارے کے قیام سے بہت پہلے ہوئی تھی، ادارے نے تو اسے ایک دو بار سے زیادہ شایع نہیں کیا البتہ اسے دوسرے شایع کرتے رہے، اب ان شاء اللہ جلد ہی اس کا نیا اور خوب صورت اڈیشن ادارہ شایع کرے گا۔

☆☆☆

مقالات

تفسیر ماجدی کے مراسلاتی ماخذ

از:- حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی

مولانا دریابادی کا دور تشکیک اور خود ان کی اپنی زبان میں دور الحاد قریب ۱۹۱۸ء تک کا تھا، اس کے بعد تصوف اور اسلامیات سے ان کا رشتہ بحال ہونا شروع ہوا، ۳۳ء میں جب وہ تھانہ بھون اپنے مربی و مرشد حضرت حکیم الامت کی خانقاہ میں تھے تو وہیں مولوی سراج الحق مچھلی شہری نے ان سے کہا کہ افسوس کا مقام ہے کہ ہم اہل سنت وجمہور امت کی طرف سے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ایک بھی نہیں، آپ ضرور یہ کام کرڈالیے۔

مولانا کے قرآنی ترجمہ وتفسیر کا یہ گویا اصل آغاز کار ہے جس کے بعد انہوں نے اپنے ہفتہ وار سچ کی اشاعت روک کر صرف اسی مقصد کے لیے خود کو وقف کردیا اور سال ڈیڑھ سال کی مدت میں سینکڑوں مصادر کی مدد سے یہ کام پورا کرلیا، مصادر میں عربی انگریزی لغات، عرب شام و مصر وعراق کا جغرافیہ، اقوام عرب و اسرائیل کی تاریخ، روم و ایران کی تاریخ، یہود و نصاریٰ کے مذاہب کی تاریخ، مجوس و مشرکین کے عقاید، تمدن کی تاریخ کی سینکڑوں ضخیم جلدوں کا مطالعہ اور ان سب کے علاوہ تفسیر، فقہ، حدیث، کلام وغیرہ کی اہم کتابوں کا مطالعہ انہوں نے اس طرح کیا کہ اس عرصے میں گویا دنیا ہی ترک کردی، مولانا نے فرمایا کہ مشکلیں پھر بھی اتنی تھیں کہ وہ رو رو دیے۔

اس جملہ معترضہ کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو تفسیر دراصل اسی انگریزی ترجمہ و تفسیر کی برکت تھی، مولانا نے لکھا بھی ہے کہ انگریزی کام کرنے سے ہمت کھل گئی اور اس کی وجہ سے اسی طرز وادا میں اور تفصیل و وسعت کے ساتھ اردو ترجمہ وتفسیر کا حوصلہ آگیا۔

تفسیر ماجدی پر نظر رکھنے والوں سے یہ مخفی نہیں کہ ترجمہ ماجدی میں سب سے بڑی رعایت مولانا تھانوی کے بیان القرآن کی موجود ہے، خود مولانا تھانوی سے وہ برابر تحریری و زبانی

مشورہ لیتے رہے، مولانا نے اعتراف وتشکر کے طور پر یہ بات کہی کہ ان کا ترجمہ ۷۵ فیصد اسی ترجمہ اشرفیہ کی نقل ہے اور تفسیر میں بھی فقہیات کا انحصار اسی تفسیر تھانوی پر ہے، ہوسکتا ہے اس نذرانہ تشکر میں کچھ حصہ مبالغہ کا ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تفسیر ماجدی کی اشاعت اول کے ساتھ ہی مولانا نے محسوس کیا کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں اب بھی نمایاں ہیں اور ترمیم کی ضرورت بہر حال ہے، یہ ضرورت داخلی بھی تھی اور کچھ خارجی اسباب بھی ہوئے، مثلاً ۴۰ء، ۴۲ء تک بنی اسرائیل دنیا کی مغضوب ترین قوم تھی، ہر ملک میں مقہور اور رسوا، ۴۵ء کے بعد سے صورت حال بدلنا شروع ہوئی، ۴۸ء میں یہود کی حکومت قایم ہوئی اور کسی نہ کسی شکل میں یہ طاقت ور بھی ہوتی گئی، مولانا کے کلامی ذہن ونظر سے یہ پہلو کیسے پوشیدہ رہتا، لازماً خیال آیا کہ یہود کی ذلت و مسکنت سے متعلق آیات پر دوبارہ نظر کی جائے اور اب تک جو حواشی لکھے گئے تھے ان میں حذف واضافہ اور ترمیم وتصرف سے کام لیا جائے، اس کے علاوہ خلائی پرواز نیز جدید سائنسی تحقیقات کا لحاظ بھی آیات طبعیات وتکوینیات میں ضروری تھا، یہ سلسلہ مولانا کے دم واپسیں تک جاری رہا، موجودہ تفسیر اور اس کے طبع اول میں یہ فرق کھلے طور پر دیکھا جاسکتا ہے

یہاں ایک دل چسپ موضوع اور بھی ہے، تفسیر ماجدی کے اغراض ومقاصد، اس کی افادیت واہمیت، اس کے فرق وامتیاز اور اس کے ادبی اسلوب کے مطالعہ کے ساتھ اس پہلو کا مطالعہ بڑا دل چسپ ہے کہ مولانا نے اس تفسیر کے لیے مآخذ ومصادر کے علاوہ کن کن حضرات سے اور کس کس طرح رجوع کیا، کبھی ایک طالب علم کی حیثیت سے سوالات کیے، کبھی جوابات پر اطمینان اور کبھی بے اطمینانی بھی ظاہر کی، تفسیر کے سلسلے میں ان کی تڑپ کس درجہ کی تھی، مطلوب کتابوں کے لیے وہ کس طرح بے چین رہتے، ان کا ذہن قرآنیات کے باب میں کیسے نکتے پیدا کرتا اور اس کی تائید وتوثیق کے لیے وہ کس طرح کوشاں رہتے، تفسیر ماجدی کے بیان کے سلسلے میں یہ باب واقعی بہت دل چسپ ہے، مولانا کے خطوط اور دوسرے مشاہیر کے خطوط میں اس قسم کے اشارے خاصے تعداد میں موجود ہیں، ہم نے اس موقع پر یہ کوشش کی ہے کہ کسی حد تک ان اشارات و نشانات کا مطالعہ کیا جاسکے، اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا تھانوی اس باب میں بھی ان کے خاص مرشد تھے جن سے وہ برابر اصلاح ومشورہ لیتے رہے، تفسیر بیان القرآن پر وہ سب سے زیادہ اعتماد کرتے

تھے اور اسی کو سب سے بہتر بھی خیال کرتے تھے، انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ دوسرے حضرات کے یہاں اکثر اوراق پر اوراق الٹے جانے سے بھی وہ گہرے نکتے نہیں ملتے جو مفسر تھانوی کے یہاں چند سطروں کے اندر میسر آجاتے ہیں لیکن مولانا تھانوی سے ان کی خط وکتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے رد وقبول میں محض عقیدت ومروت کا دخل نہیں تھا، وہ اعتماد کے ساتھ بعض مقامات پر مولانا تھانوی کی تفسیری رایوں سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار بھی کرتے رہے، مثلاً قرآن مجید نے اصحاب کہف کی نیند کی مدت ان لفظوں میں بیان کی کہ ’’ ثلث مائة سنين وازدادوا تسعا، غار والے تین سو سال تک سوتے رہے اور مزید نو سال‘‘۔

مولانا دریابادی نے تین سو کے عدد اور نو کو الگ الگ لانے کے سلسلے میں مولانا تھانوی کی توجہ اس نکتہ پر مبذول کی کہ

’’بحساب شمسی وہ مدت پورے تین سو سال کی تھی اور بحساب قمری وہی مدت ۳۰۹ سال کی، تین سال کا فرق ہر صدی میں دونوں سنوں میں ہوجاتا ہے‘‘۔

مولانا تھانوی نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور لکھا کہ

’’اس پر کوئی دلیل نہیں کہ وہ سال شمسی تھے اور بے دلیل قرآن میں جزماً دعویٰ کرنا بہت خطرناک امر ہے، ہاں غایة مافی الباب یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید یہ بنا ہو، واللہ اعلم‘‘۔

لیکن اس جواب کے باوجود مولانا دریابادی کی رائے نہیں بدلی، لکھتے ہیں کہ

’’اس قول کے غیر محقق ہونے کے باب میں حضرت مولانا کے ارشاد سے ایک حد تک اختلاف ہے، اکابر سلف سے تو برابر یہ تفسیر نقل ہوتی چلی آرہی ہے اور ابن کثیر، معالم، بحر المحیط، جلالین، روح المعانی سب میں اس کا ذکر موجود ہے بلکہ بعض نے تو اسے حضرت علیؓ کا قول بتایا ہے‘‘۔

ایک اور موقع پر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت عزیز کی ابن اللّٰہیت کے متعلق انہوں نے مولانا تھانوی کو لکھا کہ

’’آج کل کے یہود کہتے ہیں کہ ہم عزیر کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہی نہیں، یہ ہماری توحید پرستی پر اتہام ہے، اس کا جواب مجھے ان ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر نکالنا ہے‘‘۔

مولانا تھانوی نے اس کے جواب میں لکھا کہ

''اگر کہیں نہ ملے تو سہل جواب یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت کوئی جماعت ایسی رہی ہوگی جس کے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں''۔

مولانا دریابادی اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور لکھا کہ

''حضرت کا یہ جواب تو مجھے اس وقت بھی دل کو نہ لگا اور اب بھی اس کو ناکافی سمجھتا ہوں، اپنی تفسیر میں میں نے یہ عرض کر دیا ہے کہ ابن اللہ کا مفہوم ولد اللہ سے الگ ہے اور محاورہ قرآنی میں ابن و ولد مرادف نہیں، ولد سے مراد صلبی بیٹا ہی ہوتا ہے، بہ خلاف اس کے ابن عام ہے، ہر چہیتے اور لاڈلے کو ابن کہہ سکتے ہیں جیسے قرآن کی اس آیت میں نحن ابناء اللّٰہ واحباءہ ہے، ظاہر ہے کہ ابناء سے مراد صلبی بیٹے نہیں بلکہ صرف چہیتے اور لاڈلے مراد ہیں، مسیحیوں کا شرک دوہرے قسم کا تھا، حضرت عیسیٰ کو وہ خدا کا ولد اور ابن سمجھنے لگے تھے، یہود کا شرک وہاں تک نہیں پہونچا، وہ عزیزؑ کے ہر لفظ کو وحی الٰہی کا آخری لفظ قرار دینے لگے اور توریت کی گم شدگی کے بعد جب حضرت عزیزؑ کے نوشتے انہیں ہاتھ لگے تو اب بعد کے کسی ہادی و رسول کی ہدایت سے اپنے کو مستغنی سمجھنے لگے اور یہی معنی ہیں ان کے عزیر کو ابن اللہ ماننے کے''۔

کونوا قردۃ خاسئین کے عموماً دو مفہوم لیے گئے پہلا تو یہ کہ وہ لوگ واقعی بندر ہو گئے تھے اور ان کی صورتیں مسخ ہو کر بندروں کے جسم میں تبدیل ہو گئی تھیں اور دوسرا یہ کہ مسخ معنوی ہوا تھا یعنی ان کے جسم اور صورتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی البتہ ان کے اوصاف و عادات بندروں جیسے ہو گئے تھے، جمہور مفسرین نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور مولانا تھانوی بھی اسی کے قائل ہیں لیکن مولانا دریابادی نے دونوں اقوال نقل کیے، مولانا تھانوی نے اس پر فرمایا کہ دوسرے قول کو اہل حق نے غلط کہا ہے کیوں کہ بنا اس کی انکارِ خوارق ہے اس لیے یا تو اس قول کو حذف کیا جائے یا پھر اس کا غیر مقبول ہونا ہی ظاہر کیا جائے'' لیکن مولانا دریابادی اس رائے سے اس لیے متفق نہیں ہوئے کہ ان کی دلیل تھی کہ '' یہ قول تو حضرت مجاہدؒ کا ہے اور ان کا شمار بہرحال ممتاز مفسرین تابعین میں ہے اور اس قول کو ابن جریر طبری سے لے کر حافظ ابن کثیر بلکہ قاضی شوکانی تک اکثر ثقات نے نقل کیا ہے۔

حکیم الامت میں یہ قرآنی سوال و جواب بہت دل چسپ ہیں اور یہ صرف تفسیر ماجدی

سے متعلق ہی نہیں ہیں بلکہ مولانا دریابادی، بیان القرآن کے بعض مقامات کے متعلق مولانا تھانوی کو مطلع کرتے جن سے ان کے مرشد مطمئن بھی ہو جاتے اور اتفاق کر لیتے ورنہ پھر تنقیح و توضیح کے ذریعہ مطمئن کرنے کی کوشش کرتے، کوشش کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ بعض دفعہ توضیح تھانوی کے بعد بھی مولانا دریابادی مطمئن نہ ہوتے جیسے بنی اسرائیل کے متعلق ایک آیت میں وجعلکم ملوکا کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جس پر حکیم الامت میں خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا تھانوی کے بعد دوسری بڑی شخصیت جس نے تفہیم و تدبر قرآن میں مولانا کی رہنمائی فرمائی وہ مولانا حمید الدین فراہی کی شخصیت ہے، جن کے متعلق مولانا نے لکھا ہے کہ علم و فکر کے دریا، تقویٰ اور حسن عمل کے پیکر، عربی ادب کے فاضل متبحر اور قرآنیات کے نکتہ شناس، مولانا فراہی سے استفادے کا ذکر مولانا نے تفسیر ماجدی کے مقدمہ میں بھی کیا ہے، مولانا فراہی کے متعلق مولانا کے ان غیر مطبوعہ خطوط میں بھی مولانا کا احساس دیکھنے کے لائق ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہیں، یہ خطوط ابھی طبع نہیں ہوئے، ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ ان کے نومولود بیٹے اکبر کی شور بہ چشی کی رسم مولانا فراہی کے متبرک ہاتھوں سے انجام پائی، خاص جملہ یہ ہے کہ ادھر مولوی صاحب کی میری کثرت سے ملاقاتیں رہیں، اب میں ان کا نہایت معتقد ہو گیا ہوں، اب ان کی سائیکالوجی میری سمجھ میں آ گئی ......، قرآن کے متعلق تو انہوں نے ایسے نکات بیان کیے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھے، اب حال یہ ہے کہ میں ان کی صحبت کا حریص ہو گیا ہوں، خاص بات یہ ہے کہ یہ خط جنوری ۱۸ء کا لکھا ہوا ہے یعنی مولانا دریابادی کے ارادہ ترجمہ و تفسیر سے برسوں پہلے، لیکن قرآنیات کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر کا مادہ قدرت نے شروع سے ان کو ودیعت کر رکھا تھا، یہ تفسیر محض صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ توفیق الٰہی کی برکت تھی جس کا ذوق خوش نصیبوں کو شاید ازل سے ودیعت ہو جاتا ہے۔

البتہ یہ افسوس ہے کہ مولانا فراہی سے مولانا دریابادی کے استشارہ و استفادہ کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں، لیکن ان چند اشاروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فہم قرآن میں مولانا دریابادی کے جن معاصرین نے راہ ہموار کی ان میں مولانا فراہی کا نام نمایاں ہے۔

مولانا فراہی کے بعد اس سلسلے میں اگر کوئی نام سب سے نمایاں ہے تو وہ مولانا سید

سلیمان ندوی کا ہے، جو خود تو صاحب تفسیر نہ ہوئے لیکن ان کی تمام فتوحات علمیہ کی کلید اگر کوئی ہے تو یہی ذوق قرآنیات ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا کہ ان کا اصل ذوق صرف قرآنیات کا تھا، ارض القرآن ہو یا سیرت نبویؐ ہو ہر جگہ اسی کا جلوہ نظر آتا ہے، خوش نصیبی سے مولانا دریابادی اور سید صاحب کی خط وکتابت محفوظ رہ گئی، مکتوبات سلیمانی اور غیر مطبوعہ مکتوبات ماجدی بنام سید صاحب میں کثرت سے ایسے مقامات آئے ہیں جہاں ان دونوں حضرات کا اصل موضوع تدبر آیات ہی ہے۔

سید صاحب سے مکاتبت کا آغاز گزشتہ صدی کی دوسری دہائی کے آغاز سے ہوگیا تھا، ۲۱ء میں پہلی بار ایک خط میں جو اصلاً تعزیت نامہ ہے، اس میں آیات قرآنی پر مولانا دریابادی کی عملاً توجہ کی پہلی جھلک سامنے آتی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں

''قرآن پر نظر رکھیے تو یہ آلام نعمتیں معلوم ہونے لگتی ہیں، وبشر الصابرین ...... ہم المهتدون، صدمات کے معاوضہ میں جب رحمت، ہدایت ومغفرت کا ملنا یقینی ہو تو کون شخص صدمات کو بہ خوشی نہ قبول کرے گا اور یقینی اس لیے کہ یہ وعدہ لائڈ جارج کے لیے نہیں''۔

۲۳ء کے ایک خط میں یہ لے کچھ اور تیز ہوئی لکھا کہ

مجھے تو قرآن مجید نیز سیرت رسولؐ کے مطالعہ سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید بدترین طبقۂ انسانی (یعنی علانیہ کفار ومشرکین سے بھی بدتر) یہی گروہ اہل نفاق ہے (نفاق یعنی کفر + ریاکاری) عمر بن الخطابؓ سے بڑھ کر کفر میں شدید اور کون تھا؟ پھر ایمان بھی کس مرتبہ کا نصیب ہوا، اللہ اللہ، ہندہ، وحشی، ابوسفیان متعدد مثالیں ایسے ہی کفار اشد کی ملیں گی لیکن عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے اتباع کو کبھی بھی یہ توفیق نہ ہوسکی۔

۲۷ء میں مولانا دریابادی ابھی تفسیر کے باقاعدہ کام سے برسوں دور تھے لیکن فصل بہار کی آمد آمد کے قرینے نمایاں ہو چکے تھے، انہوں نے قرآن مجید کی روشنی میں سیرت رسولؐ مرتب کرنے کی سوچی، جذبہ یہ تھا کہ یہی توشۂ آخرت کا کام دے گی، ۲۷ء کے ایک خط میں اسی کے متعلق لکھا کہ خدائے کریم نے اس بے علمی اور بے عملی پر بھی اپنے حبیبؐ کی سیرت کو اپنے کلام پاک ہی سے روشن کرا دیا ہے۔

۲۷ء میں تحریک شروع ہو چکی تھی لکھا کہ میرے لیے تفسیر بحر المحیط (ابن حیان) منگوا دیجیے، چند دنوں بعد ایک اور خط میں ہیوم جیسے مخالف کے ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں مولانا کا خیال تھا کہ یہ شایع ہونا چاہیے، مخالفوں کے خیالات سے یہ جانتے ہوئے کہ وہ مخالف ہیں، واقفیت ہونی چاہیے، اس سلسلے میں سید صاحب کو لکھا کہ

''قرآن مجید میں کافروں کے اقوال کس کثرت سے نقل کیے گئے ہیں''۔

بظاہر یہ ایک جملہ ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے زاویہ نظر کی وسعتیں کس حد تک تھیں، ۳۳ء میں جب تفسیر ماجدی کا کام شروع کرنے کی توفیق ملی تو سب سے پہلے سید صاحب کو لکھا کہ

''ابھی اس خبر کو بالکل اپنے ہی تک رکھیے، ظفر الملک وغیرہ کسی پر ابھی ظاہر نہیں کر رہا ہوں، دو چار سورتیں ہو جائیں جب ذرا ہمت بندھے''۔

سید صاحب نے اس ترجمہ وتفسیر کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی ہوگی، اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

ترجمہ کو آپ آسان فرماتے ہیں، بھلا الفاظ قرآنی کی جامعیت کوئی کہاں سے لا سکتا ہے، مولانا تھانوی، شیخ الہند، شاہ صاحب دہلوی بہترین مترجم ہیں پھر بھی بندے ہیں خدا نہیں ہیں، اپنے الفاظ میں کوئی ایک ہی آدھ پہلو الفاظ قرآنی کا لا سکے باقی پہلو چھوٹ کر ہی رہے۔

۳۵ء کے ایک خط میں اپنے ترجمہ وتفسیر انگریزی کے سلسلے میں لکھا کہ

اسے تنقید ومشورہ کے لیے ہندوستان اور باہر کہاں بھیجوں، اقبال، نواب علی، نیرنگ، اسد وغیرہ پیش نظر ہیں، آپ مصر، حجاز، شام وغیرہ کے پتے بتلائیے۔

۳۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

بالمرصاد کا ترجمہ میں نے On the watch کیا ہے یعنی آپ کا پروردگار دیدبان (سب کے حال کا نگراں ہے)۔

یقال للمکان الذی اختص بالمرصد (راغب) عن ابن الانباری، المرصاد، المکان الذی یرصد فیه العدو (تاج العروس)۔

مولانا تھانوی کی تفسیر میں ہے ''گھات میں ہے (نافرمانوں) کے۔

۳۸ء میں ہی دو مہینے کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں کہ انزل فیه القرآن هدی للناس و بینت من الهدی و الفرقان کا تشریحی ترجمہ لکھ دیجیے، اس کی وجہ بھی لکھ دی کہ قرآن فہمی میں ان کا سب سے کمزور پہلو گرامر ہے، اس آیت کی مشکل یوں پیش آئی کہ بینت کا تعلق سابق و لاحق سے کیا ہے؟ بعض نے بینت کو حال مان کر عطف هدی پر کیا ہے اور من الهدی و الفرقان کو بینات ہی سے متعلق قرار دیا ہے اور بعض بینات پر رک گئے ہیں، من الهدی و الفرقان ان کے خیال میں قرآن کا ایک علاحدہ وصف ہے یعنی قرآن هدی ہے، بینات ہے اور جزو ہے الهدی و الفرقان کا، ترکیب اول سے صرف دو وصف نکلتے ہیں، هدی اور بینات من الهدی و الفرقان، اس تفصیل کے بعد ان کا اشکال اور استفساریہ ہے کہ بینات کے ترجمہ میں کچھ تو محذوف بہرحال ماننا پڑے گا مثلاً صاحب بینات۔

اسی اشکال پر پھر ایک ؛ میں لکھتے ہیں کہ

هدی للناس ر بینات من الهدی و الفرقان میں قرآن کی ایک صفت هدی تو پہلے بیان ہو چکی ہے پھر یہ بینت من الهدی کیا ہے، قرآن کو فیه بینت کے بجائے خود بینت کہنا ہمارے اردو مذاق سے بہت الگ ہے۔

یہ بھی لکھا کہ سورۂ مائدہ میں وجعل منہم القردة و الخنازیر کی تفسیر میں بڑی دشواری آرہی ہے اگر نصاریٰ مراد ہیں تو ان کی تاریخ تو محفوظ ہے، دشواری اقوال مفسرین کی بنا پر نہیں حدیث ترمذی کی بنا پر پیش آرہی ہے جہاں اصحاب مائدہ کو خنزیر میں تبدیل ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

ان اشکالات کا جواب سید صاحب نے دیا تو لکھا کہ

جی ہاں آپ نے بینت من الهدی و الفرقان کی جو ترکیب لکھ بھیجی تھی وہ سمجھ میں آگئی لیکن ساتھ ہی مولانا نے ایک اور مشکل پیش کی کہ

سورہ یوسف میں فراودوہ بار بار آیا ہے، راودتنی عن نفسی، راودتها عن نفسه، فراودوہ کے معنی تو آسان ہیں لیکن عن نفسه و عن نفسی کی قید ہر جگہ لگی ہوئی ہے، اکثر مترجمین اس کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں، بہت کچھ کھنگالنا پڑا تب جا کر مشکل حل ہوئی۔

اسی طرح ۴۱ء کے ایک خط میں لکھا کہ

طاغوت کا کوئی مناسب ترجمہ اب اردو میں نہیں ملا ہے بلکہ پورا قرآنی مفہوم ہی گرفت میں نہیں آیا ہے، راغب وغیرہ کی یہ تشریح کہ کل ما عبد من دون الله بہت ہی مبہم ہے، آپ کی کوئی خاص تحقیق ہو تو آیندہ کسی خط میں لکھ دیجیے گا، ترجمہ قرآن میں ایک خاص دشواری تعیین ضمائر کی ہے ایک ہی آیت بلکہ جزو آیت کے اندر ایک ہی ضمیر کے مرجع الگ الگ۔

۴۵ء میں اپنی تفسیر کے نام کے سلسلے میں سید صاحب سے رجوع کیا کہ

تفسیر جو کچھ الٹی سیدھی لکھ رہا ہوں اس کا کوئی نام ابھی ذہن میں نہیں آیا، کچھ مدد فرمایے اگر بہ آسانی خیال میں آجائے، زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔

۴۸ء میں تفسیر اردو کا کام مکمل ہوا تو لکھا کہ

''اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کے کلام پاک کی خدمت سے ایک بڑی حد تک فراغت ہوگئی'' جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ان دونوں اکابر کی خط و کتابت کا پتہ ۱۱ء سے چلتا ہے، مکتوبات سلیمانی میں ۱۵ء کا ایک خط اس دور کا ہے جب مولانا دریابادی اپنے الحاد کے عہد شباب سے گزر رہے تھے، سائیکلوجی پر ان کی تحریریں آچکی تھیں لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غلط ہی مقصد سے سہی اس وقت بھی مولانا مرحوم کو قرآن سے مس تھا، چنانچہ مستشرقین کی تقلید میں انہوں نے سائیکلوجی آف قرآن لکھنے کی فکر کی، سید صاحب کو معلوم ہوا تو لکھا کہ

نفسیات القرآن بشوق لکھیے لیکن داد دینے کے لیے، نہ عیب جوئی کے لیے، قرآن میں نفسیات کا جو گر ہے وہ شاید وہی ہو جس کو آپ تحریک نفس انسانی بذریعہ خطابیات و دعوت متلذذات کہیں گے بہرحال اگر آپ اسلام کی حمایت کا اس سے کام لیں تو خدارا جلد لکھیے اور اگر کچھ اور نیت ہے تو اس امت مرحومہ پر للہ رحم فرمایے۔

پھر ایک خط میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ الٰہیات القرآن میں آپ کو جو اشتباہ پیش آیا ہے وہ وہی مسئلہ قدر و قضا کا مغالطہ عامة الورود ہے، بہرحال جس ادھیڑ پن میں آپ نے ایک شب بسر کی، دنیا ویسی لاکھوں شب بسر کر چکی ہے۔

اس مختصر جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانوی، مولانا فراہی اور حضرت سید سلیمان ندوی سے تعلقات اور خط و کتابت بھی تفسیر ماجدی کا اہم ماخذ و مصدر ہے اور اندازہ ہوتا

ہے کہ مولانا دریابادی نے اس تفسیر کی تیاری میں کیسی سخت محنت کی۔

ان اکابر کے علاوہ مولانا کے اور دوسرے احباب واعزہ کے نام دستیاب خطوط میں بھی اسی قسم کے اشارے جا بجا ملتے ہیں جن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکابر کے علاوہ مولانا اپنے برابر کے لوگوں بلکہ اصاغر سے بھی معلومات کے حصول میں کس درجہ کوشاں رہتے، ان کا مقام بلند، طالب علم کی راہ میں کبھی آڑے نہ آتا، تفسیر ماجدی کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ان مکتوبات کا مطالعہ کم اہمیت کا حامل نہیں۔

ہمارے سامنے مکتوبات ماجدی مرتبہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی مطبوعہ کلکتہ کی دوسری جلد ہے جس میں مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے نام خاصے خطوط ہیں، ۵۴ء کے ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ

طنزیات قرآن پر جی میں آتا ہے کہ ایک مستقل مقالہ معارف یا صدق کے لیے لکھ دوں اور کافروں کے حق میں عذاب الیم کی بشارت کم از کم دس بارہ آیتوں میں تو ضرور آئی اور پھر اور آیتیں ذق انک انت العزیز الکریم قسم کی یا آخرت میں منافقوں کے لیے خطاب قیل ارجعوا وراءکم کل آیات تیس سے تو بہرحال کم نہیں اور اگر مکراللہ، خادعھم، اکید کیدا وغیرہ کو بھی شامل کرلیا جائے تو میزان کہیں زیادہ ہوجاتی ہے، بدھ ازم وغیرہ سے متاثر ہوکر جس طرح غصہ اور جنس دونوں کو معیوب سمجھ لیا گیا ہے اور بزرگوں کی تصویر ذہنوں میں یہ جم گئی ہے کہ وہ کسی حال میں نہ اشتعال قبول کریں نہ ان کی قوت مردانہ کبھی حرکت میں آئے، اسی طرح طنز کو یکسر ایک غیر اسلامی فعل سمجھ لیا گیا ہے، اسے صاف کرنے کی اور اس کے حدود وقیود بتانے کی بڑی ضرورت ہے۔

اسی خط میں یہ بھی لکھا کہ

ہاں صاحب سورہ مائدہ آیت وضو کی تفسیر میں قول جمہور کی تصدیق مزید میں میں نے ۳-۴ سطریں تاج کمپنی کو لکھ کر بھیجی تھیں، جواب آیا کہ اب کوئی صورت نہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا اپنی تفسیر میں برابر ترمیم واضافہ کے لیے مطالعہ اور غوروفکر جاری رکھتے، انہوں نے اپنی تحقیقات بلکہ خیالات کو کبھی حرف آخر نہیں سمجھا۔

ایک اور خط جو ۵۵ء کا ہے اس میں لکھا کہ

......قرآن نے اصل زور انفاق پر دیا ہے نہ کہ کسب مال پر، باقی ایک ثانوی درجے میں قرآن مطلق مال کو بھی محل انعام میں لایا ہے، تر کو کم با موال وبنین وغیرہ متفرق آیات ہیں، نیز قصہ سلیمان وایوب، ذوالقرنین وغیرہ ہیں، بہرحال جو اس وقت مال پرستی کا فتنہ چلا ہوا ہے اس کے مقابلے میں یہ تھوڑی سی زیادتی ہر طرح گوارا ہے۔

مکتوبات ماجدی کی تیسری جلد حال میں شائع ہوئی ہے، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا اویس نگرامی ندوی کے نام خطوط میں جا بجا تفسیری اشارے موجود ہیں، کہیں کسی آیت پر استفسار ہے، کہیں ان حضرات سے غوروفکر کرنے کا مطالبہ ہے، کہیں ان کے لیے تفسیری موضوعات کی نشان دہی ہے اور اس سلسلے میں ترغیب وتحریص بھی ہے، یہ خطوط علوم القرآن کے سلسلے میں بہت دل چسپ اور مفید تو ہیں ہی، ان سے تفسیر ماجدی کی تیاری اور ترتیب پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

۵۳ء میں جبکہ تفسیر کا کام پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا، انہوں نے مولانا اویس صاحب مرحوم کو ایک خط میں لکھا کہ ’’فرصت عمر اب کتنی کم باقی رہ گئی ہے اور کام ابھی کرنے کو کتنے پڑے ہیں، نظر آں عزیز ہی پر پڑتی ہے، اجمالاً دو ایک چیزیں لکھے دیتا ہوں خود نہ کرسکا تو ان کاموں کو اپنے ذمے سمجھیں‘‘۔

مولانا کے مجوزہ منصوبے کیا تھے یہ اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ النساء والصبیان فی القرآن کا عنوان عین اسی زمانہ میں مولانا کے ذہن میں آیا، وہ چاہتے تھے کہ دو اجزا میں اس کو تقسیم کیا جائے، پہلے جزو میں مطلقہ عورتوں اور لڑکیوں کا ذکر احکام ومسائل جیسے نکاح، طلاق، خلع، وراثت، زنا، قذف، حجاب اور یتیمی وغیرہ اور دوسرے حصہ میں مریم، امراۃ نوح، ام موسی، زوج آدم وغیرہ نساء قرآنی کا ذکر ہو۔

مولانا کے ذہن میں طبقات المفسرین کا خاکہ بھی تھا جس میں مفسرین کے مفصل تذکرے اور ان کے مختلف سلسلوں کو واضح کیا گیا ہو، مولانا نے اس سلسلہ کو خانوادے سے تعبیر کیا مثلاً بیضاوی، صاحب بحر اور صاحب روح ایک سلسلے کے ہیں، صاحب معالم اور خازن ایک سلسلے

کے، مولانا یہ بھی چاہتے تھے کہ اندلسی مفسرین کی خصوصیات اور علوم عصریہ سے تاثر وغیرہ کو واضح کیا جائے، اسی مذکورہ خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی تراجم قرآنی پر مفصل تبصرہ کرنا چاہتے تھے، افسوس تو یہ ہے کہ یہ جامع پروگرام مکتوب نگار و مکتوب الیہ دونوں کی حسرت ہی رہا لیکن یہاں صرف یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ مولانا تفسیر کے سلسلے میں کیسی فکر رکھتے تھے، اسی خط میں ان کے یہ جملے آج بھی نئے حوصلہ مندوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکتے ہیں کہ

"یہ کام خوش عقیدگی سے ہٹ کر خالص تحقیق کی راہ سے کرنے کا ہے، آخر انہیں حضرات نے ایک دوسرے کے کام کو ناکافی سمجھ کر جب ہی تو خود ہاتھ لگایا، ایک کو دوسرے میں کیا کمی نظر آئی اور کتنی جگہ نظر آئی، سب پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے"۔

۵۴ء میں ایک اور خط میں مولانا اویس صاحب کو لکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور اس کے متعلقات پر کام کرنے کی ابھی بہت ضرورت ہے...... اللہ کے سامنے عہد کرلیں کہ اپنی ساری زندگی اصلاً خدمت قرآن کے لیے وقف رکھیں گے، دوسری خدمات کی حیثیت صرف ضمنی ہے۔

۵۸ء کے ایک خط میں بشریت انبیاء کے سبب مطالعہ کو بیان کیا کہ علم اور انبیاء، قدرت اور انبیاء، خوف، جذبات، غم و مسرت، بھوک اور تعب، تاثر، نسیان وغیرہ پر لوگوں نے خوش عقیدگی میں غلو کرکے جو ڈانڈے الوہیت سے ملا دیے ہیں انشاء اللہ اس کی پوری اصلاح ہوجائے گی، ضمناً ذکر، ملائکہ کی بھی عبدیت کا آجائے گا۔

۶۰ء میں مولانا کو مجاز القرآن اور فراء نحوی کی معانی القرآن مل گئیں تو دونوں کی جلدیں پڑھنے کے بعد لکھا کہ جلدی جلدی پڑھے ڈال رہا ہوں جیسے کوئی بھوکا کھانے پر ٹوٹ کر گرتا ہے، لیکن یہ بھی لکھا کہ افسوس کہ یہ کتابیں متعلم قرآن کے لیے اتنی کارآمد نہیں جتنا اندازہ تھا۔

ایک بار مولانا کو معلوم ہوا کہ ایک کتاب کتب خانہ ندوہ میں ہے تو لکھا کہ

غالباً بلاغت قرآن پر ہے، ذرا اس کا پورا نام تو لکھ دیجیے۔

۶۱ء میں تفسیر کی آخری جلد مطبوعہ تاج کمپنی لاہور جب مولانا کو ملی تو اس کو دیکھنے کے بعد لکھا کہ

گو اب مسرت پر غالب جذبہ حسرت و ندامت ہے، دوسرے ایڈیشن میں کچھ نہیں تو

بہت کچھ بڑھانا ہے۔

مولانا کا ذوق تحقیق کسی طرح سیر نہ ہوتا تھا، ۶۶ء کے ایک خط میں لکھا کہ

کوئی شامی طالب علم اب بھی ندوہ میں موجود ہوں گے جیسا کہ کچھ عرصے پہلے تھے، اگر ہوں تو ذرا ان سے دریافت کرلیجیے کہ شام و فلسطین میں کھجور کے پھل آنے کا کون زمانہ ہوتا ہے، انگریزی مہینوں میں اگر سال میں دو بار پھل آتے ہوں تو دونوں کب کب؟۔

اس کے جواب میں جو اطلاع ملی وہ مولانا کے لیے خوش آئند تھی، چنانچہ لکھا کہ

بڑے دن کے لیے سالہا سال سمجھتا رہا ہوں کہ ۲۵ر دسمبر ہرگز حضرت مسیح کا یوم ولادت نہیں، رومیوں کے یہاں سورج دیوتا کا جنم ۲۵ر دسمبر کو منایا جاتا تھا، بس وہی آنکھ بند کرکے عیسائیوں نے لے لیا، اب کچھ دن ہوئے نظر سورہ مریم کی آیت رطبا جنیا پر پڑی دل نے کہا کہ یہ تو قرآن نے صاف بتلا دیا کہ ولادت مسیح اس موسم میں ہوئی جب تازہ کھجور پیدا ہوتے ہیں اور وہ یقیناً دسمبر کا مہینہ نہیں ہوتا۔

ترجمہ کے متعلق لکھا کہ

تجربے سے معلوم ہوا کہ ترجمہ دشوار ترین چیز ہے اور شرح و ترجمانی سہل ہے اگر اتنے ترجمے پہلے سے سہارے کے نہ مل جاتے تو چند ہی آیتوں کے بعد ہمت جواب دے جاتی۔

۷۲ء میں جب مولانا صحت سے بڑی حد تک معذور ہوگئے تھے، اس وقت بھی تحقیق و جستجو میں کوئی فرق نہیں آیا، اس زمانہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں

ہاں صاحب یہ بتائیے کہ سورہ دخان کے شروع میں دخان مبین سے اگر قحط مکہ مراد ہے جو اکثر مفسروں نے لیا ہے تو یہ کب اور کس سنہ نبوی یا ہجری میں پڑا تھا حوالہ اگر حدیث کا نہیں تو کم سے کم سیرت یا تاریخ کا ہو، میں نے ایک حوالہ ڈھونڈ نکالا ہے مگر وہ فقہ کا ہے، سرخسی نے المبسوط جلد ۴، کتاب السیر ص ۹۲ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس حوالے پر قناعت کرنے کا جی نہیں چاہتا۔

یہی حال مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام خطوط کا ہے، ۵۶-۵۵ء میں جب مولانا ندوی دمشق گئے اور وہاں سے کچھ معلومات بھیجے تو مولانا کا تڑپنا دیکھیے کہ

کیا فلسطین خصوصاً بیت المقدس تک ہو آنے کی صورت نہیں نکل سکتی اگر ممکن ہوتا تو

ممکن تھا کہ حضرت مسیح کے سلسلے میں جغرافی و تاریخی دونوں قسم کے معلومات کچھ اور حاصل ہو جاتے، بہر حال دمشق میں کچھ واقفیت تو یہودیوں، نصرانیوں اور ان کے مختلف فرقوں کے متعلق حاصل ہو ہی سکتی ہے، قرآن مجید کے پیش نظر تو سب سے بڑھ کر شامی مسیحیت ہے علمائے شام یا خود مسیحیوں اور یہودیوں نے ان مباحث پر عربی یا انگریزی، جو لکھا ہو تو ان کتابوں کا آرڈر میری طرف سے بے تکلف دے دیجیے، انشاء اللہ قیمت یہاں سے فوراً روانہ کردوں گا، حکومت شام کے محکمہ آثار قدیمہ کے مطبوعات میں بھی تاریخ انبیاء کے سلسلے میں کام کی چیزیں مل سکتی ہیں۔

۵۸ء کے ایک خط میں لکھا کہ

آج کل تفسیر اردو کی نظر ثانی کر رہا ہوں، کئی نئے نئے مضمون اور نکتے چلے آرہے ہیں، اپنے اوپر نفریں کرتا ہوں کہ پہلی بار یہ چیزیں کیوں نہ سوجھیں

خدمت قرآن کے سلسلے میں مولانا کا یہ پہلو سب سے زیادہ موثر ہے کہ

کتنی حسرتیں جو قرآنیات کے سلسلے میں دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں، جی بے اختیار چاہتا ہے کہ مستشرقین خصوصاً یروشلم یونیورسٹی کا سارا ذخیرہ اپنے قبضے میں ہوتا۔

یہ داستان بڑی طویل ہے، میں نے صرف جستہ جستہ حصوں کو یہاں پیش کیا ہے، صرف اس مقصد سے کہ تفسیر ماجدی کی شان و مرتبت میں اس کے فاضل گرامی تفسیر نگار کی محنت، دیدہ ریزی، جستجو اور بے پایاں تحقیق کی ایک جھلک سامنے آجائے اور اس سے صرف مفسر ہی نہیں اس کی تفسیر کا مرتبہ و مقام متعین ہونے میں آسانی ہوسکے۔

تذکرہ مفسرین ہند حصہ اول

از- مولوی محمد عارف عمری

اس جلد میں آٹھویں نویں صدی ہجری کے آخر اور شاہ ولی اللہ صاحب سے قبل کے سوا ۱۶ اصحاب تصنیف مفسرین کا تذکرہ اور ان کی تفسیروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

قیمت: ۶۰ر روپے

☆☆☆

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ اور ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ

از- جناب محمد سجاد☆

(۲)

۲۹ر جون ۱۹۸۷ تا یکم جولائی ۱۹۸۷ء پاکستان ہجرہ کونسل کا ایک سمینار اسلام آباد میں منعقد ہوا، اس میں "دارالمصنفین اعظم گڑھ" سے مدیر معارف سید صباح الدین عبدالرحمن بھی تشریف لائے، اس سمینار میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی شریک تھے، م۔ صباح الدین عبدالرحمن نے معارف جولائی ۱۹۸۷ء کے شذرات میں جہاں سمینار کی روداد بیان کی، وہاں اس سمینار میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے ملاقات اور ان کی ہم نشینی کو زندگی کے عزیز ترین لمحات قرار دیا، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"اس اجتماع میں جہاں اور ملکوں کے معزز نمایندوں سے ملاقاتیں رہیں وہاں اپنی زندگی کے عزیز ترین لمحات مکرم و محترم ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی صحبتوں میں گزارے جن میں بڑی علمی روحانیت محسوس کرتا رہا، چار روز کا زیادہ تر وقت ان ہی کی ہم دمی اور ہم نشینی میں گزرا، ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ جوان تھے، اب وہ بوڑھے ہوچکے ہیں، آلہ سماعت استعمال کرتے ہیں لیکن باتوں اور تحریروں میں اب تک جوان رعنا ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں جتنے علمی کام کیے ہیں وہ ان کے بعد اسی طرح یاد کیے جائیں گے جس طرح اکابر مشاہیر مصنفوں کے کارنامے یاد کیے جاتے ہیں، پھر اپنے استغنا اور بے نیازی کی مثالیں بھی ایسی پیش کی ہیں جو گزشتہ دور میں ائمہ اسلام پیش کرتے رہے ہیں اور جن سے ہمارے ماضی کی عظمت میں تابانی اور درخشانی پیدا ہوئی ہے، پاکستان ہجرہ کونسل کی طرف سے ان

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ افکار و تمدن اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

کی خدمت میں دس لاکھ روپے کا انعام پیش کیا گیا مگر انھوں نے اسی وقت اسلام آباد، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ہدیہ کر دیا، ایسی بے نیازی کی مثالیں کم ملیں گی، ان کا مستقل قیام پیرس میں ہے، وہاں وہ کوئی غیر معمولی راحت اور عشرت کی زندگی بسر نہیں کرتے جس سے ان کو روپے کی ضرورت نہ ہو مگر اپنی قناعت پسندانہ اور خوددارانہ زندگی میں ان کو جو ماہانہ پنشن ملتی ہے اسی میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ روحانی نشاط و انبساط محسوس کرتے ہیں، جس کے بعد ان کے لیے بڑی سے بڑی دولت کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہیں، مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر لی ہے لیکن شبستان محبت میں حریر و پرنیاں بنے ہوئے ہیں، عشق اسلام کے مضراب سے ان کے علمی تار حیات کا جو نغمہ بلند ہو رہا ہے، وہ نہ صرف ان کے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے نور حیات بنا ہوا ہے، اقبال نے مرد مومن کی جو یہ تعریف کی ہے کہ اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل، اس کی ادا دل فریب اور اس کی نگہ دل نواز ہوتی ہے تو اس کا مکمل نمونہ ان کو اپنی بار بار ملاقاتوں میں پایا، وہ یاد آرہے ہیں، ان کی صورت جنت نگاہ اور باتیں تسنیم سامعہ بنی ہوئی ہیں اور آیندہ زندگی میں بھی رہیں گی، دارالمصنفین کے رسالہ معارف کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کے متعلق اپنی جو رائے ظاہر کی وہ ہمارے لیے بہت بڑی سند ہے[۱۱]۔

الغرض ''دارالمصنفین'' اور اس کے ذمہ داران سے آخری دم تک ان کا تعلق رہا، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحبان سے خط و کتابت بھی رہی اور اپنی ذاتی وابستگی کا اظہار بھی کرتے رہے، نومبر ۱۹۸۸ء کے معارف میں اپنے ایک مقالہ ''تراجم قرآن مجید'' کی تمہید میں لکھتے ہیں:-

''مقالہ ہذا کی تدوین کے لیے جب معارف مؤقر کا متعلقہ پرانا شمارہ نکالا تو کچھ عجیب باتوں سے دوچار ہوا، اس میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی بھی مقالہ نگاروں میں تھے اور ان کا نام اب رسالے کے ٹائٹل کو زیب دے رہا ہے، اسی ٹائٹل کے آخری صفحہ پر ''خطبات مدراس'' اور ''رحمت عالمؐ'' جیسی شہرۂ آفاق کتابوں کا اشتہار

بھی تھا، ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ میری ''خطبات بہاول پور'' کا نظر ثالث شدہ ایڈیشن اسلام آباد میں چھپ گیا ہے جو ''خطبات مدراس'' ہی کا خوشہ چین اور گویا تکملہ ہے، اسی طرح میری فرانسیسی سیرت النبی ﷺ کے پانچویں ایڈیشن کے پروف بھی آئے ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ چند ماہ میں چھپ جائیں گے، اسی شمارہ معارف میں جگن ناتھ آزاد کی ''منظوم تاریخ انسانیت'' سے ختم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت کا متعلقہ اقتباس بھی پڑھا، بے اختیار آنسو بہ نکلے[۱۲]۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے انتقال پر ملال پر مدیر معارف جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا نثر میں نظم نما مرثیہ، دارالمصنفین اور اس کے رفقا کی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ عقیدت و محبت اور ان کی بے مثل دینی و علمی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے، مولانا اصلاحی کہتے ہیں:-

''افسوس صد افسوس کہ وہ فرزند اسلام نہیں رہا جس کی اذان توحید سے مغرب کی وادیاں گونج رہی تھیں اور ہزاروں نفوس ایمان و اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو رہے تھے، وہ سرچشمہ ہدایت بند ہو گیا جس سے مریضان کفر و ضلالت شفایاب ہو رہے تھے، واحسرتا! کہ دین و دانش کا وہ آفتاب غروب ہو گیا جس سے مشرق و مغرب دونوں ضیا بار تھے اور تاریکیوں میں بھٹکنے والے راہ یاب ہو رہے تھے، علم کا وہ بے کراں سمندر رکد ہو گیا جس سے اسلام کا درخت سرسبز و شاداب تھا، دریائے تحقیق کا وہ شناور اور غواص چلا گیا جو یورپ کے کتب خانوں میں اپنے آبا کی موجود کتابوں سے علم کے جواہر نکالتا تھا، وہ پیکر علم و فن روپوش ہو گیا جو ابر نیساں بن کر پون صدی موتی لٹا رہا تھا، حکمت و معرفت کا وہ مجمع البحرین دنیا سے رخصت ہو گیا جو مشرق کے علمی مے خانوں سے بھی سرشار تھا اور مغرب کے میکدۂ حکمت سے بھی مخمور تھا، وہ ہستی نہیں رہی جس کے فضل و کمال کا سکہ بلاد مشرق اور عالم اسلام ہی میں نہیں یورپ و امریکہ میں بھی چل رہا تھا، حیف صد حیف اس ذات گراں کا خاتمہ ہو گیا جس کا دماغ نادر معلومات کا خزینہ اور سینہ علوم نبویؐ کا سفینہ تھا، جس کا قلم دشمنان اسلام کی علمی خیانتوں اور عیاریوں کو بے نقاب کرتا تھا اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت و

صداقت کو آشکار کرتا تھا، آہ ثم آہ! کہ وہ سراپا علم و تحقیق روپوش ہوگیا جو تاریخ اسلام اور سیرت نبی ﷺ کے اولین مصادر اور مسلمانوں کے نایاب اور گم شدہ علمی اندوختوں کو ڈھونڈھ نکالتا تھا، وہ وجود مقدس خاموش ہوگیا جس نے پیرس میں بھی آداب سحرخیزی نہیں چھوڑے، جس کی راسخ العقیدگی کو مغرب کے فسق و فجور نے اور پختہ کردیا تھا اور فسق اور معصیت کی طغیانی نے اس کے ایمان و یقین میں مزید اضافہ کردیا تھا، واویلاہ! کہ وہ کامل الایمان اور راسخ العقیدہ غایب ہوگیا جس کے پائے استقامت و عزیمت کو کفر و الحاد کی بادصرصر کبھی متزلزل نہیں کرسکی، جس کی متاع دین و تقوی کو حسن و عشرت کی جلوہ گاہیں غارت نہ کرسکیں، یعنی شہرۂ آفاق عالم و محقق نامور مصنف و فاضل، اسلام کے جاں نثار و فدائی اور اس کے مخلص داعی و مبلغ، نکتہ داں سیرت نگار، دیدہ ور مورخ، اسلامی فقہ و قانون کے ماہر، علوم دینیہ میں یگانہ اور جدید علوم میں فخر روزگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۹۴ برس کی عمر میں ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ کو داعی اجل کو لبیک کہا، ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' جن کی پاکیزہ زندگی اور مطہر شخصیت قرون اولی کے مسلمانوں کا نمونہ تھی اور جو اس عہد کے ابن سعد و طبری، بلاذری و یعقوبی، ابن اسحاق و ابن ہشام، ابن اثیر و ابوالفدا اور شمس الائمہ سرخسی اور علامہ ابن عابدین تھے، ان کی موت سے عالم اسلام ویران ہوگیا، دنیائے علم میں خاک اڑنے لگی، اہل علم، اصحاب نظر اور محققین سراپا درد و حسرت بنے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں ؎

آفاق ہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام ☆ بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگرے[۳]

۲- ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نزدیک ماہنامہ ''معارف'' کی قدر و منزلت

ماہنامہ ''معارف'' کا اجرا ہوا تو یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت پرآشوب دور تھا، پہلی جنگ عظیم کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی، اس ماحول میں علمی و تحقیقی مضامین لکھنے والے بس خال خال ہی تھے، معارف نے دینی، علمی، تحقیقی و ادبی ذوق پیدا کیا اور لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا ایک ٹھوس حلقہ پیدا ہوگیا جو روز بہ روز بڑھتا ہی گیا، اس کے اثر سے نئے اور پرانے دونوں طبقے متاثر ہوئے، معارف کو ایک علمی و ادبی اور تحقیقی رسالہ بنانے کے لیے سید صاحب نے اپنی تمام تر

صلاحیتیں وقف کردیں، اجرا کے وقت سے کئی سال تک تن تنہا اس رسالہ کا تمام بار اپنے دوش ناتواں پر اٹھائے رہے، ہر نمبر کے لیے دو ایک مستقل مقالے لکھنا، کئی کئی صفحے کے شذرات تیار کرنا، متعدد کتابوں پر تبصرہ کرنا، یہ سب سید صاحب کے ذمہ تھا، اس کے علاوہ دارالمصنفین کے ناظم کی ذمہ داریاں الگ سے تھیں، یہ سید صاحب کی محنت اور لگن کا نتیجہ تھا کہ ''معارف'' کی اہمیت اور قدر افزائی ملک کے اساطین علم و ادب نے کی اور ہر طبقہ کے متخصصین نے اس کو پسند کیا، علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے سید صاحب کے نام اپنے ایک خط میں معارف پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:-

''یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے''۔[۴]

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط میں سید صاحب کو تحریر کرتے ہیں:-

''معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے، بحمد للہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں اور صرف آپ کی یہ دولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم و تصنیف کے لیے وقف ہے''۔[۵]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنے دور طالب علمی سے ''معارف'' کے قاری تھے، بعد ازاں اس کے مقالہ نگار رہے، قیام حیدرآباد (دکن) تک تو رسالہ آسانی سے دست یاب ہوجاتا تھا مگر جب پیرس میں مستقل سکونت اختیار کرلی تو وہاں بھی ''معارف'' کو منگواتے رہے اور اگر ''معارف'' نہ ملتا تو بے تاب ہوجاتے، چنانچہ مئی ۱۹۵۰ء میں اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

''سلام مسنون نیاز مندانہ و رحمۃ اللہ و برکاتہ، ایک اور مضمون ملفوف ہے، مناسب ہو تو شایع فرمادیا جائے، گزشتہ مضمون سنا کہ شایع ہوا، اگرچہ تا حال پڑھنے یا دیکھنے میں نہیں آیا، خیر اسے کوئی اہمیت نہیں، غرض تو اشاعت و اطلاع تھی، گزشتہ دو سال سے ''معارف'' دیکھنے کو ترستا تھا ابھی حال میں ایک دوست کے یہاں ان شماروں کا بڑا حصہ دیکھنے میں آیا اور دل بھر آیا، مسرت نہ صرف اس عزیز دور افتادہ دوست سے مکرر ملنے پر ہوئی بلکہ اس پر بھی کہ معیار اگر بلند تر نہیں ہوا تو ماشاءاللہ پرانا معیار برقرار ضرور ہے''۔[۶]

دارالمصنفین کے ایک رفیق مولانا ابوالجلال ندوی ''اعلام القرآن'' کے عنوان سے مختلف

موضوعات پر ''معارف'' میں لکھ رہے تھے، ان کے مضامین ڈاکٹر صاحب نے پڑھے اور ان کی تحقیق پر ان الفاظ میں ان کو داد دی:-

''مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلے مولانا ابوالجلال ندویؒ کی میں نے کوئی چیز پڑھی ہو، گزشتہ دو سال میں ان کے جو مضمون چھپے ہیں، ان سے ایسا معلوم ہوا کہ آسمانِ علم پر ایک نیا کوکب دُرّی، ایک درخشاں تارہ نمودار ہوگیا ہے، خدا اسے بہت دن تاباں رکھے، ان کی تحقیقات قابل رشک ہیں...... مولانا کی ''اعلام القرآن'' کا انتظار رہے گا، خدا کرے جلد تکمیل کو پہنچے اور یہ خدمت قرآن، صاحب قرآن جل شانہ کے ہاں مقبول ہو''۔[7]

ڈاکٹر صاحب معارف کے ہر نئے شمارے کا شدت سے انتظار کرتے اور جب پرچہ مل جاتا اور اس میں اپنے ذوق کا کوئی مضمون یا مقالہ پڑھتے تو اس پر اظہار خیال بھی کرتے اور اگر معارف ڈاک میں کہیں ضایع ہو جاتا تو اس سے انہیں کافی پریشانی لاحق ہوتی، چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

''کل شام کی ڈاک میں جون ۵۱ء کا معارف ملا، مسرت سے ورق گردانی کی، اردو املاء کی تاریخ پر ایک عمدہ مضمون نظر سے گزرا...... جون کا معارف تو مل گیا لیکن اپریل اور مئی کے پرچے غایب ہیں، جون کے پرچے میں جو ششماہی فہرست ہے اس سے تو معلوم ہوا کہ ''دانتے کی نظم طربیہ'' کا مضمون جو بھیجا گیا تھا، وہ شاید اپریل میں چھپ بھی گیا لیکن دیکھنے سے تا حال محروم رہا، معلوم نہیں ڈاک کے ان ڈاکوؤں کا کیا علاج ہے''۔[8]

مدیر ''معارف'' جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا اور مضمون کی فرمائش کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ایک تفصیلی خط ارسال فرمایا، جس میں ماہنامہ ''معارف'' کی قدر و منزلت کی بے پناہ تعریف فرمائی، لکھتے ہیں:-

''آج صبح عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا

ع اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

میں معارف میں کم لکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میری نظر میں اس کی عزت کم ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ آج کل ساری دنیائے اسلام میں، عرب ہو کہ عجم، کوئی اسلامی رسالہ اسلامیات پر اعظم گڑھ والے ''معارف'' کے معیار کا نہیں، اوروں کا کاغذ اور طباعت بہتر ہو سکتی ہے لیکن مضامین کے مندرجات میں علمی معیار بدقسمتی سے کچھ بھی نہیں، خدا ''معارف'' کو سلامت باکرامت رکھے، میں خود معارف میں جگہ پاؤں تو اپنے لیے باعث عزت سمجھتا ہوں''۔[9]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

''میں معارف کا ادنی ناظر ہوں، دل میں اس کا احترام بہت ہے، چوں کہ وہ مرجع انام ہے اور لوگ اب بھی آیندہ بھی اس سے استفادہ کریں گے''۔[10]

ڈاکٹر صاحب ''معارف'' کے محتسب بھی تھے، اس میں املاء یا کسی مقالے کے مندرجات میں غلطی نظر آتی تو فوراً اصلاح فرما دیتے، یہاں تک کہ اپنے مضامین کے پروف وہ زیادہ دقتِ نظر سے پڑھتے اور ذرا بھی املاء کی غلطی نظر آتی تو اگلے شمارے میں اس کی تصحیح کر دیتے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

''معارف'' کی میرے دل میں بہت عزت ہے، وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ، ایک ماخذ ہوگا، اسی لیے اس کے مندرجات کے متعلق آپ کو اگر تکلیف دیتا بلکہ دل دکھاتا رہتا ہوں، التجا ہے کہ یہ قصور معاف کر دیں گے کہ مقصد رنجیدہ کرنا بالکل نہیں''۔[11]

معارف میں ڈاکٹر صاحب کا آخری خط اکتوبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شایع ہوا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، عمر کے اس حصے میں بھی ''معارف'' سے انہیں کس قدر عقیدت تھی اور اس کے مضامین میں وہ کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔[12]

۴- اشاریہ

ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مضامین و مقالات، مکتوبات شایع ہوئے، ان کی تالیفات و تصنیفات اور فکر و نظر پر اہل علم کی بعض تنقیدی آرا بھی شایع ہوئیں، یہاں

اس کا اشاریہ (زمانی ترتیب سے) پیش خدمت ہے، اشاریہ میں مکتوبات کے مندرجات کی تلخیص پیش کی گئی ہے:-

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۱۔	رسالہ "الکشافہ"، حیدرآباد، مدیر ڈاکٹر محمد حمید اللہ	رسالہ	سید ریاست علی ندوی	۲۷	۲-۱	جنوری ۱۹۳۱	۷۷
۲۔	"رومی اور اسلامی ادارہ غلامی" مرتبہ محمد حمید اللہ، بزم قانون عثمانیہ کالج، حیدرآباد	کتاب	ع	۲۸	۱	جولائی ۱۹۳۱	
۳۔	یورپی الفاظ و اعلام کا اردو املا	مقالہ		۲۸	۲	اگست ۱۹۳۱	۱۲۰-۱۰۳
۴۔	آنحضرتؐ کا خط قیصر روم کے نام (معترضین کے جواب دیے گئے)	مقالہ		۳۵	۶	جون ۱۹۳۵	۴۳۰-۴۱۶
۵۔	عربوں کی جہاز رانی پر "استدراک" قسط-۱	مقالہ		۳۷	۵	مئی ۱۹۳۶	۳۳۶-۳۲۵
۶۔	عربوں کی جہازرانی پر "استدراک" قسط-۲	مقالہ		۳۷	۶	جون ۱۹۳۶	۴۱۴-۴۰۵
۷۔	تصحیح مقالہ عربوں کی جہازرانی پر "استدراک"	مکتوب	سید سلیمان ندوی	۳۸	۲	اگست ۱۹۳۶	۱۳۴
۸۔	عہد نبوی کا نظام تعلیم	مقالہ		۴۸	۵	نومبر ۱۹۴۱	۳۳۶-۳۲۵
۹۔	قرآنی تصور مملکت	مقالہ		۴۸	۶	دسمبر ۱۹۴۱	۴۳۱-۴۰۵

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۱۰۔	عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات	مقالہ		۵۰	۱	جولائی ۱۹۴۲	۴۲-۵
۱۱۔	عہد نبویؐ کا نظام تعلیم (از ڈاکٹر محمد حمید اللہ) ادارہ ترقی تعلیم اسلامی، حیدرآباد	کتاب	ادارہ	۵۰	۴	اکتوبر ۱۹۴۲	۳۱۸
۱۲۔	عربی حبشی تعلقات، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ادارہ ترقی تعلیم اسلامی، حیدرآباد	کتاب	ادارہ	۵۰	۶	اکتوبر ۱۹۴۲	۳۱۸
۱۳۔	الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، حبیب کمپنی، حیدرآباد دکن	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۵۱	۱	جنوری ۱۹۴۳	۷۷-۷۶
۱۴	استدراک پر مقالہ "صفی ہندی" جو عرب دنیا میں مشہور ہوئے	مختصر خط	سید سلیمان ندوی	۵۱	۶	جون ۱۹۴۳	۴۳۲
۱۵۔	تقویم جلالی اسلامی شمسی کلنڈر	مقالہ		۵۲	۶	دسمبر ۱۹۴۳	۴۴۵-۴۴۰
۱۶۔	دارالعلوم حیدرآباد کی تعلیمی جوبلی	روداد		۵۳	۲	فروری ۱۹۴۴	
۱۷۔	مدراس کی عظیم الشان نمائش تاریخ و تمدن اسلامی	روداد		۵۲	۴	اکتوبر ۱۹۴۳	
۱۸۔	انجمن ہائے قرضہ بے سودی	مقالہ		۵۳	۳	مارچ ۱۹۴۴	۲۱۶-۲۱۱

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۱۹۔	مکتوب پارس: مصحف عثمانی کے بارے میں معلومات ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۴۵ میں میرا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس مضمون میں مصحف عثمانی میں سے نصف ورق کا فوٹو شائع ہوا ہے	مکتوب	سید ریاست علی ندوی	۵۶	۲	اگست ۱۹۴۵	۱۲۱-۱۲۲
۲۰۔	عربوں کی جہازرانی "استدراک"	مزید معلومات		۵۷	۲	فروری ۱۹۴۶	۱۴۶-۱۴۷
۲۱۔	تصادم قوانین کا اسلامی تصور اور عمل	مقالہ		۵۷	۲	فروری ۱۹۴۶	۷۵-۱۰۷
۲۲۔	قرآن سے متعلق جرمنوں کی خدمات	مقالہ		۵۷	۳	مارچ ۱۹۴۶	۱۴۳-۱۵۱
۲۳۔	عربوں کی جہازرانی "استدراک"	مختصر تصحیح		۵۷	۶	جون ۱۹۴۶	۴۷۱-۴۷۲
۲۴۔	عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مکتبہ جامعہ دہلی، ص ۳۱۷	کتاب	سید ریاست علی ندوی	۵۷	۶	جون ۱۹۴۶	۴۷۵-۴۷۶
۲۵۔	منشور اقوام متحدہ، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مترجم) حیدری کشتی، کتب خانہ حیدرآباد، ص: ۲۵	کتاب	سید ریاست علی ندوی	۵۹	۱	جنوری ۱۹۴۷	۷۸-۷۹

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۲۶۔	مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، محمد اشرف لاہور، ص: ۳۵۵	کتاب	ا-ج	۶۱	۴	اپریل ۱۹۴۸	۳۱۵-۳۱۷
۲۷۔	قانون بین الممالک از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، حیدرآباد دکن، ص: ۳۵۶	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۶۴	۲	اگست ۱۹۴۹	۱۵۸-۱۵۹
۲۸۔	اسلامی اصول قانون اور نظریہ دستوری کا ارتقا، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، احسان بک ڈپو حیدرآباد، ص: ۷۷	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۶۴	۳	ستمبر ۱۹۴۹	۲۳۹-۲۴۰
۲۹۔	ابو حنیفہ دینوری کی کتاب النبات	مقالہ		۶۴	۶	دسمبر ۱۹۴۹	۴۵۱-۴۶۳
۳۰۔	پیرس کا ایک مکتوب: معارف کے معیار و خدمات پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، مولانا عبد السلام ندوی کے طب پر مضمون کو پسند کیا ہے، ابن سحنون کی کتاب الجامع لأقوال الحكماء...... في الادوية المفردة کے مخطوطات کی تفصیل بیان کی ہے، مولانا	مکتوب	سید سلیمان ندوی	۶۵	۵	مئی ۱۹۵۰	۳۹۰-۳۹۲

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
	ابوالجلال ندوی کے اعلام القرآن پر معارف میں شائع شدہ مقالات کو بے حد پسند کیا ہے اور مولانا کو حسین علم پر ایک نیا کوکب دری سے موسوم کیا ہے ابو محفوظ الکریم کی تفسیر طبری پر خدمات کو سراہا ہے اور بتایا ہے کہ تفسیر طبری پر کن کن گوشوں اور عنوانات کے تحت مزید کام ہو سکتا ہے						
۳۱۔	کتاب النبات دینوری	مقالہ		۶۵	۶	جون ۱۹۵۰	۴۶۰-۴۵۶
۳۲۔	رسول اللہ ﷺ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ادارہ اسلامیات لاہور، ص: ۲۸۰	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۶۷	۳	مارچ ۱۹۵۱	۲۳۸-۲۳۷
۳۳۔	دانتے کی نظم "طربیہ ربانی"	مقالہ		۶۷	۴	اپریل ۱۹۵۱	۲۹۷-۲۹۲
۳۴۔	مکتوب حمید: جون ۱۹۵۱ کے معارف میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کا ایک مضمون "اردو املاء کی تاریخ" شائع ہوا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ	مکتوب	شاہ معین الدین ندوی	۶۸	۲	اگست ۱۹۵۱	۱۴۱-۱۳۹

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
	صاحب نے اس مضمون کو پسند فرمایا اور اس موضوع پر اظہار خیال فرمایا کہ املاء کے ارتقاء میں تین پہلو خاص کر موثر ہوتے ہیں: ۱- پہلے یہ کہ جب کوئی بولی پہلے پہل لکھی یعنی تحریری زبان بنتی ہے تو کچھ تو صحیح تلفظ کی تلاش میں مشق وخطا کو ناگزیر دخل ہے ۲-دوسرے یہ کہ خود تلفظ میں مختلف اسباب سے ارتقا یا فرق پیدا ہو جاتا ہے ۳-کوئی لکھی جانے والی زبان اپنا رسم الخط کسی نوبت بدل ڈالے تو نئے خط میں املا کو متعین ہوتے ہوئے کافی عرصہ لگتا ہے، آخر میں "معارف" ڈاک میں ضائع ہونے کی شکایت کی ہے						
۳۵۔	استانبول کی مؤتمر مستشرقین عالم	روداد		۶۹	۳	مارچ ۱۹۵۲	۲۲۸-۲۱۳

نمبر شمار	عنوان مقالہ/ مندرجات خط/کتب	مقالہ/ خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۳۶۔	رومی قانون اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات (اطالوی مستشرق گارلونالینو) کے مضمون کا ترجمہ اور شروع میں مقدمہ لکھا ہے	مقالہ		۷۱	۱	جنوری ۱۹۵۳	۳۴-۴۸
۳۷۔	مولانائے روم کی سات سو سالہ برسی	مقالہ		۷۱	۵	مئی ۱۹۵۳	۳۸۲-۳۸۴
۳۸۔	کیمرج کی موتمر مستشرقین عالم	روداد		۷۴	۶	دسمبر ۱۹۵۴	۴۵۳-۴۶۰
۳۹۔	صحیفہ ہمام بن منبہ، مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، الہدیٰ بک ایجنسی حیدرآباد دکن ص ۱۴۶	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۷۶	۶	دسمبر ۱۹۵۵	۴۷۷-۴۷۸
۴۰۔	فقہ کی تشکیل اور آغاز کا معمہ (قسط-۱) مشہور مستشرق (گ، د، بوسکے) کے مقالہ کا ترجمہ	مقالہ		۸۱	۳	مارچ ۱۹۵۸	۱۶۵-۱۸۴
۴۱۔	موتمر مستشرقین عالم کا اجلاس میونک ۱۹۵۷	روداد		۸۱	۳	مارچ ۱۹۵۸	۲۲۸-۲۳۵
۴۲۔	فقہ کی تشکیل اور آغاز کا معمہ (قسط-۲)	مقالہ		۸۱	۴	اپریل ۱۹۵۸	۲۴۵-۲۶۱
۴۳۔	قرآن مجید کے فرانسیسی تراجم	مقالہ		۸۴	۲۲	اگست ۱۹۵۹ء	۴۶۵-۴۶۸
۴۴۔	موتمر مستشرقین عالم کا پچیسواں اجلاس ماسکو	روداد		۸۶	۵	نومبر ۱۹۶۰	۳۸۹-۳۹۷

نمبر شمار	عنوان مقالہ/ مندرجات خط/کتب	مقالہ/ خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۴۵۔	مکتوب (ایک سوال): قاضی اطہر مبارک پوری کے ایک مضمون مطبوعہ معارف اپریل مئی ۱۹۶۰ بہ عنوان "عرب وہند کے قدیم علمی وثقافتی تعلقات" کے تحت جدید دریافت وشائع شدہ نادر کتاب الذخائر والتحف کے مصنف کے بارے میں قاضی صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور فرمایا کہ اس کتاب کا مصنف قاضی رشید بن زبیر (دادا) ہے نہ کہ پوتا، راجہ ذہمی یا ذہبی کے بارے میں استفسار کیا ہے کہ کیا پڑھنا چاہیے مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکتوب کا ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک پارہ کی فوٹو کاپی ارسال کی ہے اور فرمایا کہ اپنی فرانسیسی سیرت نبویہ کا اردو ترجمہ کروں مگر مولف کے لیے کیسے ممکن ہے کہ خود اپنی ہی تحریروں کا ترجمہ کرے تو دوسرے کام رہ جائیں گے، مصحف عثمانی جو کہ	مکتوب	شاہ معین الدین ندوی	۸۶	۶	دسمبر ۱۹۶۰	۴۴۹-۴۵۰

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
	ڈرہام یونیورسٹی میں ہے اس کا میکروفلم منگوالیا ہے						
۴۶۔	"سیرت نبویہ" مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) ڈاکٹر صاحب کے حالات اور علمی خدمات کے علاوہ ان کی فرانسیسی سیرت نبویہ پر تفصیلی تبصرہ ہے (از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ)	مقالہ	ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ	۸۸	۱	جولائی ۱۹۶۱	۲۲-۳۱
۴۷۔	القاضی الرشید مولف کتاب الذخائر و التحف	مقالہ		۹۳	۵	مئی ۱۹۶۴	۳۶۱-۳۷۴
۴۸۔	امام سرخسی کی نوسوسالہ برسی	مقالہ		۹۴	۳	ستمبر ۱۹۶۴	۱۶۵-۱۷۷
۴۹۔	کتاب المعتمد فی اصول الفقہ لابن الحسین البصری المعتزلی (مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ) المعہد العلمی دمشق صفحات ۱۱۸۰	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۹۹	۱	جنوری ۱۹۶۷	۷۸-۷۹
۵۰۔	امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ حبیب اینڈ کمپنی حیدرآباد صفحات ۴۳	کتاب	شاہ معین الدین ندوی	۹۹	۲	فروری ۱۹۶۷	۱۵۹
۵۱۔	اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل	مقالہ		۱۰۰	۳	ستمبر ۱۹۶۷	۱۶۰-۱۶۱

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۵۲۔	مؤتمر مستشرقین عالم امریکہ میں	روداد		۱۰۰	۵	نومبر ۱۹۶۷	۳۲۵-۳۳۸
۵۳۔	امام محمد کی بارہ سو سالہ یادگار وفات ترکی میں	مقالہ		۱۰۳	۶	جون ۱۹۶۹	۴۴۴-۴۵۴
۵۴۔	مکتوب حمید: پیرس کے روحانی کلیسا کے ایک پادری "کرنستان ورجیل گیورگیو" نے فرانسیسی زبان میں سیرت پر ایک کتاب لکھی جس کا ترجمہ فارسی میں ہوا تھا اور مولانا وارث علی نے اردو میں منتقل کیا مئی ۱۹۷۱ کے معارف میں اس پر تبصرہ ہوا ڈاکٹر حمید اللہ نے مصنف کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پادری اور راہب ہے زندگی افسانہ نویسی میں گزری سیرت نبویہ پر بھی ایک افسانہ لکھا اسے عربی رسم الخط بھی نہیں آتا جب کہ کتاب میں نہ صرف عربی مطبوعات کے حوالے ہیں بلکہ نادر مخطوطات کا بھی ذکر ہے جب کہ مؤلف نے زندگی میں کبھی	مکتوب	شاہ معین الدین ندوی	۱۰۸	۲	اگست ۱۹۷۱	۱۴۹-۱۵۱

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجاتِ خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
	ان کی صورت بھی نہیں دیکھی ہوگی، اس کی کتاب میں انتہائی فحش اور پاجی پن کی چیزیں بھی ہیں ہمارے سادہ اور بھولے مسلمان بھی نادانستہ اس کے ترجمے کرکے اس گناہ میں شریک ہورہے ہیں						
۵۵۔	مرکزی سیاست اور ۱۲ ان شخصی	مقالہ		۱۰۹	۶	دسمبر ۱۹۷۲	۴۵۳-۴۴۹
۵۶۔	کیا اسلامی قانون : [illegible] قانون کا مرہون منت ہے (مستشرق فیتز جیرالڈ) کے ایک مقالہ کا ترجمہ (قسط-۱)	مقالہ		۱۱۱	۱	جنوری ۱۹۷۳	۵۶-۴۱
۵۷۔	مکتوب حمید: ماہنامہ "معارف" کی قدر ومنزلت اور علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور اپنے مقالات کی اس میں اشاعت کو باعث عزت قرار دیا، اس کے سلامت و باکرامت رہنے کی دعا کی ہے اپنے فرانسیسی ترجمہ قرآن اور سیرت نبویہ کے بارے میں بتایا ہے ،	مکتوب	شاہ معین الدین ندوی	۱۱۱	۱	جنوری ۱۹۷۳	۷۴-۷۳

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجاتِ خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
	صباح الدین عبدالرحمن اور دیگر احباب معارف کی خدمت میں سلام پیش کیا ہے						
۵۸۔	کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہون منت ہے (قسط-۲)	مقالہ		۱۱۱	۴	اپریل ۱۹۷۳	
۵۹۔	کتاب النبات، ابوحنیفہ دینوری مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (المعہد الفرنسی قاہرہ) ص ۴۴۷	کتاب	محمد نعیم ندوی صدیقی	۱۱۶	۳	ستمبر ۱۹۷۵	۲۳۷-۲۳۱
۶۰۔	سیرت ابن اسحاق، تحقیق و تعلیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ، معہد الدراسات والابحاث الرباط المغرب ص ۳۹۵	کتاب	سید صباح الدین عبدالرحمن	۱۱۹	۴	اپریل ۱۹۷۷	۳۱۶-۳۱۵
۶۱۔	پیرس سے ایک مکتوب گرامی: "معارف" میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی بجائے عبداللہ بن عمرؓ چھپ گیا، اس کی ڈاکٹر صاحب نے اصلاح فرمائی اور بتایا کہ کتابت حدیث کی ممانعت کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئیں ہے بقول محمد مصطفیٰ الاعظمی	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمن	۱۲۸	۲	اگست ۱۹۸۱	۱۵۲-۱۵۱

نمبر شمار	عنوان مقالہ/ مندرجات خط/ کتب	مقالہ/ خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
	یہ صحیح حدیث نہیں، صرف ایک حدیث جو حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ہے، جو صحیح مسلم نے روایت کی ہے اس کو بھی بقول ابن حجر امام بخاری نے رد کیا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ان کی ذاتی رائے ہے، سیرت شامی کی اشاعت پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔						
۶۲۔	خطبات بہاول پور از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور (ص ۳۳۲)	کتاب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۳۱	۲	فروری ۱۹۸۳	۱۶۰-۱۵۸
۶۳۔	"اسلام اور مستشرقین پر مضامین سے متعلق کچھ خطوط"، فروری ۱۹۸۳ کے معارف میں ایک مقالہ نگار نے پکھتال کو بھی مستشرقین میں شامل کیا، اس کی تصحیح فرمائی کہ محمد پکھتال انگریز تھے، نہایت مخلص مسلمان تھے، حیدرآباد مدرسہ فرقانیہ کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے نمازی آدمی تھے، اسلامک کلچر	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمن	۱۳۱	۴	اپریل ۱۹۸۳	۲۹۹-۲۹۸

نمبر شمار	عنوان مقالہ/ مندرجات خط/ کتب	مقالہ/ خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
	جاری کیا ان کی خدمات کا ذکر کیا ہے						
۶۴۔	اسلام اور مستشرقین کی بیرونی ڈاک (مکتوب حمید) دارالمصنفین میں ۴۰، ۴۵ برس قبل مدیر معارف سید صباح الدین عبدالرحمن سے ملاقات اور میزبانی و مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا ہے، اسلام اور مستشرقین سیمینار پر اپنے تاثرات میں لکھا کہ مستشرقین کی شکایت سے ان کو اتفاق نہیں، ان میں ہر ایک پیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا اور جو اکا دکا رکھتا ہے وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی دکھانے لگتا ہے اگر ان کو خالص علمی انداز میں ان کی غلطیاں بتائیں تو عام طور پر فوراً مان لیتے ہیں، پھر اپنی ایک دو مثالیں دیں، آخر میں لکھا ہے کہ ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمن	۱۳۱	۵	مئی ۱۹۸۳	۳۹۰-۳۸۹

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
	فہیموں کو خالص علمی انداز سے دور کریں، ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر، خطبات بہاول پور پر تبصرہ پڑھا ہے، تمنا تو تنقید و تصحیح کی تھی......						
۶۵۔	ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک خط پر اظہار رائے، مستشرقین کے حوالے سے مذکورہ خط پر تنقید کی گئی ہے، دو خطوط ہیں:	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۳۲	۲	اگست ۱۹۸۳	۱۴۵-۱۲۷
	۱-سید حبیب الحق ندوی (جامعہ ڈربن) ۲-مکتوب نگار نے نام نہیں لکھا (فقط کلکتہ لکھا ہے)	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۵۱-۱۴۶
۶۶۔	مکتوب پیرس: جشن سلیمانی کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، شروع میں ایسے جشن کے جائز ہونے کا استفسار کیا ہے پھر خود ہی فرمایا ہے یہ تحدیث نعمت کے طور پر جائز ہے اور خود جشن میلاد النبی بھی جائز ہے، اس کے بعد سید سلیمان ندوی کی خدمات بیان کی ہیں	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۳۵	۳	مارچ ۱۹۸۵	۲۳۵-۲۳۱
	اور پارس میں مختلف تقریبات محافل اور مساجد میں سید صاحب کی دینی و علمی خدمات سے عوام کو متعارف کروایا ہے، اس کی مکمل روداد قلم بند کی ہے						
۶۷۔	حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ	مقالہ		۱۳۵	۵	مئی ۱۹۸۵	۳۸۸-۳۸۱
۶۸۔	مکتوب پیرس: بتایا ہے کہ وراقت پر ایک مضمون تیاری کے مراحل میں ہے، اسٹریا کے کتب خانے میں سلجوقی دور کا ایک قرآن مجید کا ٹکڑا موجود ہے اس کا فوٹو منگوایا ہے اسے اپنے فرانسیسی مقالہ "تاریخ خط عربی" میں شایع کر رہا ہوں، صلح حدیبیہ میں آپ کی حکمت عملی کے بعض پہلوؤں کی طرف نشان دہی کی ہے	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۳۷	۲	فروری ۱۹۸۶	۱۵۲
۶۹۔	پیغمبر اسلامؐ کے سیاسی مکتوبات میں سے چھ کی اصلیین (فرانسیسی) از ڈاکٹر محمد حمید اللہ پارس ۱۹۸۵ء، ص ۲۴۰	کتاب	ادارہ	۱۳۸	۵	نومبر ۱۹۸۶	۳۹۴-۳۹۲

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
۷۰۔	مکتوب پیرس: سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے آنکھوں کا آپریشن کروایا صحت کامل کی دعا کی ہے ماہنامہ "معارف" کے لیے احترام کے جذبات کا ذکر ہے	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۳۹	۳	مارچ ۱۹۸۷	۲۳۴
۷۱۔	مکتوب پیرس: معارف جنوری ۱۹۸۷ میں پروفیسر عبدالرحمٰن مومن صاحب کے مضمون کو پسند فرمایا ہے، حضرت عمرو بن حزم کے بارے میں اپنی کتاب الوثائق السیاسیة کے پانچویں اڈیشن میں مزید معلومات کے بارے میں بتاتے ہیں	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۳۹	۵	مئی ۱۹۸۷	۳۸۹
۷۲۔	شذرات: میں ہجرہ کونسل کے سمینار میں شرکت اور اس کی روداد میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جو کہ اس سمینار میں شریک ہوئے، ان سے ملاقات اور ان کے بارے میں تاثرات کا ذکر کیا ہے	شذرات از سید صباح الدین عبدالرحمٰن		۱۴۰	۱	جولائی ۱۹۸۷	۴-۲

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ وسن	صفحات
۷۳۔	مکتوب پیرس: مغربی مصنفین کے اسماء کے تصحیح، تلفظ اور ہجاء کا ذکر فرمایا ہے، "معارف" میں ان املاء کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے، "معارف" کو تاریخ حال کا وثیقہ، ایک ماخذ قرار دیا ہے	مکتوب	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۴۰	۶	دسمبر ۱۹۸۷	۴۷۱
۷۴۔	جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی وفات پر تعزیتی خطوط، تعزیتی خط ہے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے دو ملاقاتوں کا ذکر ہے، "معارف" کو دنیا کا سب سے بلند پایہ علمی پرچہ قرار دیا ہے، اس میں آیندہ بھی لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے	مکتوب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۱	۵	مئی ۱۹۸۸	۳۸۳-۳۸۲
۷۵۔	فتح مکہ (۸ھ) کی چودہ سو سالہ یادگار (مع مکتوب پاریس): خط میں نماز فجر کے بعد تسبیح کے اپنے معمولات کا ذکر فرمایا پھر فتح مکہ کے حوالے مقالہ	مقالہ	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۲	۱	جولائی ۱۹۸۸	۶۱-۵۶

نمبر شمار	عنوان مقالہ/ مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
	تحریر فرمایا						
۷۶۔	"معارف کی ڈاک": معارف جولائی ۱۹۸۸ میں ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں کتابت کی غلطیاں در آئیں ان کی اصلاح فرمائی ہے	مکتوب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۲	۲	اگست ۱۹۸۸	۱۵۳
۷۷۔	"معارف کی ڈاک": معارف کی علمی خدمات کا ذکر فرمایا، اپنی تحریرات "معارف" کو ہی ارسال کرتا ہوں، فرانسیسی ترجمہ قرآن کے پندرہویں اڈیشن کی طباعت کا ذکر فرمایا ہے	مکتوب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۲	۴	اکتوبر ۱۹۸۸	۳۱۴
۷۸۔	تراجم قرآن مجید	مقالہ		۱۴۲	۵	نومبر ۱۹۸۸	۳۹۱-۳۷۹
۷۹۔	"معارف" کی ڈاک (مکتوب پیرس): "اپریل ۱۹۸۹ کے معارف" میں جناب محمد عارف عمری رفیق دار المصنفین نے "عبد بن حمید" کے حوالے سے مقالہ لکھا، ڈاکٹر صاحب نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی	مکتوب	محمد عارف عمری	۱۴۳	۵	مئی ۱۹۸۹	۳۹۱-۳۹۰

نمبر شمار	عنوان مقالہ/ مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/ تبصرہ	مکتوب الیہ/ مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
	اور لکھا "ماشاء اللہ" حق تحقیق ادا کیا گیا ہے کتاب السرد والفرد کے مؤلف نے اپنی اسناد میں ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن زیاد السندی کا ذکر کیا تھا اس کے حالات کے بارے میں عارف عمری سے کہا ہے، جناب محمد عارف عمری نے ڈاکٹر صاحب کے خط کے ساتھ ہی اصل راوی کے حالات مع حوالہ لکھ دیے تھے						
۸۰۔	کتاب الردۃ ونبذۃ من فتوح العراق از محمد بن عمر بن واقدی، تہذیب ڈاکٹر محمد حمید اللہ، الشرکۃ المتحدہ للتوزیع، بیروت ص ۱۸۶	کتاب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۵	۱	جنوری ۱۹۹۰	۷۶-۷۴
۸۱۔	**HOMMAGE A MAHMET** جگن ناتھ آزاد کی نظم (ولادت باسعادت) کا فرانسیسی ترجمہ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، Editions Tougi, 30 ruerene Boulanger 75101	کتاب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۵	۶	جون ۱۹۹۰	۴۸۰

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۸۲۔	مکتوب پیرس: معارف اگست ۱۹۵۰ء میں لفظ "تیونس" شائع ہوا اس کا صحیح تلفظ واملاء "تونس" ہے، لکھا ہے کہ القزوینی کی کتاب السرد والفرد میں حضرت جعفر بن نسطورا الرومی کے حالات کی تلاش ہے	مکتوب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۵۰	۴	اکتوبر ۱۹۹۲	۳۱۴-۳۱۵
۸۳۔	کتاب السرد والفرد فی صحائف الاخبار لابی الخیر احمد بن اسماعیل القزوینی مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ	کتاب/ مقالہ	پروفیسر عبدالرحمٰن مؤمن	۱۵۴	۱	جولائی ۱۹۹۴	۳۴-۴۱
۸۴۔	مکتوب پیرس: القزوینی کے بارے میں جاننے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے پارس میں ایک ایرانی پروفیسر دوست سے درخواست کی تو انہیں نے "کتاب السرد والفرد" کے مصنف کے بارے میں معلومات پیش کیں جو اس خط کے ساتھ شائع ہوئیں	مکتوب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۵۴	۱	جولائی ۱۹۹۴	۷۷-۷۸

نمبر شمار	عنوان مقالہ/مندرجات خط/کتب	مقالہ/خط/تبصرہ	مکتوب الیہ/مبصر	جلد	عدد	ماہ و سن	صفحات
۸۵۔	مکتوب پیرس: "معارف" میں ایک ہندی ترجمہ قرآن کا ذکر آیا تو مدیر معارف کو لکھا کہ سورۃ المنافقون ۶۳/۴ کی آیت (كانهم خشب مسندة) کا ترجمہ کیا ہوا ہے؟	مکتوب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۵۴	۴	اکتوبر ۱۹۹۴	۳۰۸
۸۶۔	سیرت ابن اسحاق، تحقیق وتعلیق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مترجم نور الٰہی، سنٹر کلچرل اسلامک حیدر آباد دکن، ص ۳۹۵	کتاب	ضیاء الدین اصلاحی	۱۶۹	۱	جنوری ۲۰۰۲	۷۷
۸۷۔	شذرات: ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی وفات پر شذرہ	شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۱۷۱	۳	مارچ ۲۰۰۳	۱۶۲-۱۶۳

حواشی حوالہ جات

۱ معارف ج ۱۴۰، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۸۷، ص ۲-۴، "شذرات"۔ ۲ معارف ج ۱۴۲، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۸۸، ص ۳۷۹۔ ۳ معارف ج ۱۷۱، شمارہ ۳، مارچ ۲۰۰۳، ص ۱۶۲-۱۶۳، "شذرات"۔ ۴ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۸۰، مکتوب نمبر ۴۔ ۵ محمد سرور (مرتب) خطوط محمد علی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۴۰، ص ۲۶۔ ۶ معارف ج ۶۵، شمارہ ۵، مئی ۱۹۵۰، "پیرس کا ایک مکتوب"، ص ۳۹۰۔ ۷ ایضاً۔ ۸ معارف ج ۶۸، شمارہ ۲، اگست ۱۹۵۱، "مکتوب حمید"، ص ۱۳۹۔ ۹ معارف ج ۱۱۱، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۷۳، "مکتوب حمید"، ص ۷۳۔ ۱۰ معارف ج ۱۳۹، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۸۷، ص ۲۳۴، (مکتوب پیرس)۔ ۱۱ معارف ج ۱۴۰، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۸۷، ص ۴۷۱، (مکتوب پیرس)۔ ۱۲ تفصیل کے لیے دیکھیے "معارف" ج ۱۵۴، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۹۴، ص ۳۰۸، (مکتوب پیرس)۔

☆☆☆

جاپان میں اشاعتِ اسلام
اور عبدالرشید ابراہیم

از- پروفیسر محمد حسان خاں☆

عبدالرشید ابراہیم بیسویں صدی کے عظیم مصلح اور مشہور سیاسی لیڈر تھے، وہ انیسویں صدی میں روسی ترکستان کی تجدیدی تحریک کے بانی بھی تھے، انہوں نے روسی ترکوں میں بیداری پیدا کرنے اور انہیں روسی ظلم وستم کے مقابلے پر آمادہ کرنے کے لیے کئی اخبار اور رسالے نکالے، اپنی ان اصلاحی خدمات کی بنا پر انہیں روسی حکومت کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ جلاوطن کردیے گئے۔

عبدالرشید ابراہیم جب ۱۹۱۰ء میں ترکی آئے تو وہاں کے حالات نہایت پرآشوب تھے، طرابلس (لیبیا) اور بلقان میں جنگ جاری تھی، اس کے فوراً بعد پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس میں عبدالرشید ابراہیم نے تمام مسلمانوں کو ترکی کی مدد پر آمادہ کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا، طرابلس کی جنگ میں وہ بہ نفس نفیس شریک ہوکر عثمانی فوج کا حوصلہ بڑھاتے رہے، بلقان کی جنگ کے دوران دنیا کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں اور خود روس میں اپنی قوم کے لوگوں کو خطوط ارسال کیے، اس کی وجہ سے نہ صرف روس کے بہت سے ترک مسلمان بلکہ دنیا بھر کے مسلمان بھی اپنے ترک بھائیوں کی مدد کے لیے محاذ جنگ پر پہنچ گئے تھے، اسی طرح ہسپتالوں میں مسلم نرسیں زخمیوں کی خدمت کے لیے پہنچیں، انہوں نے ہندوستان، افغانستان، ملیشیا، جاپان، چین اور دوسرے ملکوں میں ترکوں کی اعانت کے لیے خطیر رقمیں جمع کیں، ان کی کوشش سے جرمن حکومت نے ان تتار مسلمانوں کو جن کو جنگ عظیم اول میں گرفتار کیا تھا، نہ صرف آزاد کیا بلکہ ان کا ایک مخصوص فوجی دستہ

☆ شعبۂ عربی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال۔

''ایشین دستہ'' کے نام سے بنایا جس نے عراق کے محاذ پر انگریزوں سے جنگ کی۔

عبدالرشید ابراہیم کا وطن عبدالرشید ابراہیم کے خاندان کا تعلق ازبکستان کے شہر بخارا سے تھا، انہوں نے مغربی سائبیریا کی طرف ہجرت کی اور ارتمش نہر کے کنارے واقع شہر تارا میں اقامت گزیں ہوئے، یہ آج کل روسی کامن ویلتھ کا ایک ملک ہے، اس علاقہ کے اصل باشندوں کا تعلق مختلف ترکی قبایل سے تھا جن کے نام ہیں: آیا، اشتیک، کورداک اور عورہ وغیرہ مگر ان کے مجموعہ اور اس علاقہ میں رہنے والے تمام ہی ترکوں کو تتار سائبیریا کہا جانے لگا۔

عبدالرشید ابراہیم کے اجداد سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی میں یہاں آکر آباد ہوئے[1] اس علاقہ کے لوگوں نے بخارا کے جن لوگوں کی زبردست کوششوں سے اسلام قبول کیا، ان میں عبدالرشید کے اجداد بھی شامل تھے[2] تتار مچھلی اور خشکی کے حیوانات کے شکار پر زندگی گزارتے تھے، ۱۵۹۸ء میں جاپان حکومت کے تابع ہونے کے بعد اس خطے میں تجارت کو بڑا فروغ نصیب ہوا اور یہ علاقہ بہت اہم تجارتی مرکز بن گیا اور یہاں کے لوگوں کا اثر ونفوذ چین اور ہندوستان تک پھیل گیا۔

روس کے قبضہ کے بعد اس علاقہ کی تجارتی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی، اس سے پہلے روسی وسطی ایشیا میں داخل نہیں ہوسکے تھے، اب انہوں نے تتار تاجروں کو استعمال کرکے بہت نفع کمایا، تتار کی تجارتی مہارت کی وجہ سے روسی حکومت نے ان کو فوجی ٹریننگ سے مستثنیٰ کردیا، یہ استثنا ۱۹۱۵ء تک جاری رہا، ان لوگوں سے ٹیکس بھی کم لیے جاتے تھے لیکن یہ تجارتی سرگرمیاں انیسویں صدی ہی میں تارا کے محاصرہ کے بعد ماند پڑنے لگی تھیں، سائبیریا میں ریلوے لائن کا نہ بچھایا جانا سیاسی وجوہ سے تھا، روسی دباؤ اور عیسائی مشنریز کی جدوجہد نے ان سب سرگرمیوں کو ختم کردیا اور عیسائیت نہ قبول کرنے کی وجہ سے سائبیریا کو پس ماندہ علاقہ بنادیا گیا، یہی وجہ تھی کہ کئی تاتاری عیسائی ہوگئے پھر اس علاقہ میں ملک بدر لوگوں کی کثرت سے بھی مسلمانوں کی تعداد یہاں کم ہوگئی اور بیسویں صدی کی ابتدا میں بہت سے تتاری ترکی کی طرف ہجرت کرگئے[3]

عہد قدیم میں جب یہ لوگ طاقت ور تھے اور روسی حکومت نے انہیں ہر طرح کی مراعات دے رکھی تھی تو اس وقت انہیں اپنی آزادی کا کچھ خیال نہیں آیا، حالانکہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی

میں ممکن تھا کہ روس انہیں آزادی دے دیتا لیکن ذی شعور اور بیدار مغز لوگوں نے عوام کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں دلایا، دوسرے اس کا سب سے بڑا سبب تعلیمی نظام کا مفقود ہونا تھا، روس نے قبضے کے بعد تعلیمی ادارے نہیں کھولے، چند سمجھ داروں کے علاوہ دوسرے لوگ شکوک وشبہات کی وجہ سے روسی اداروں میں اپنے بچوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے، چھوٹے چھوٹے مکاتب میں قرأت وکتابت اور کسی قدر دینی علوم کی تعلیم ہوتی تھی لیکن عام طور سے اس وقت کے اساتذہ و مشائخ میں یہ قابلیت ہی نہیں تھی کہ طلبہ میں اعلا وارفع اقدار وافکار کی تخم ریزی کرسکیں اور ان میں آزادی وحریت کے جذبات کی پرورش کرسکیں، بخارا کے مکاتب ومدارس کی اصلاح کے لیے وہاں کے علما وزعمانے وسطی ایشیا میں یہ تحریک انیسویں صدی میں چلائی، علما میں سب سے پہلے عبدالناصر قرضاوی (۱۷۷۴-۱۸۱۲) کے یہاں اصلاح مدارس کی بات ان کی کتاب "الارشاد للعباد" میں ملتی ہے، اس اصلاحی مہم کے دوسرے قاید مشہور مؤرخ شہاب الدین المرجانی (۱۸۱۹-۱۸۴۴) اور موسیٰ جار اللہ (۱۸۷۵-۱۹۴۹) تھے، ان لوگوں نے اصلاح کا عمل پورے علاقے میں پھیلا دیا، ان حضرات کے علاوہ دوسرے دانش ور اور تجارت پیشہ لوگ بھی ان اصلاحی تحریکوں میں معاون ومددگار تھے جن میں عبدالرشید ابراہیم کا درجہ بہت نمایاں ہے، انہوں نے اپنی بیوی اور اولاد کو اپنی جائے پیدائش تارا میں چھوڑ کر بہ جز افریقہ اور امریکہ کے پوری دنیا کا دورہ اس مقصد سے کیا کہ اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں کے مسایل کو اٹھائیں اور ان کی آواز ساری دنیا میں پہنچادیں، انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی مقصد میں لگادی، روس میں آزادی کے متوالوں سے مل کر ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی بنیاد رکھی اور تاتاریوں کو آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دلائی، غرض ترکی اور یورپی ممالک کے اشتراک سے (مصطفیٰ کمال پاشا کے انقلاب سے پہلے) انہوں نے غیر معمولی جدوجہد کی اور قازان شہر میں ۱۹۰۴ء میں مسلمانوں کے وفود کا بہت اہم اجتماع منعقد کیا، اس زمانے میں شخصی مراسلت جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھی، انہوں نے پیٹرس برگ میں ایک مطبع قایم کیا اور اخبار اور رسالے نکال کر اپنے ہم وطنوں اور عثمانی سلطنت کے مسایل کو عالم میں پھیلانے کی کوشش کی ہے، کچھ عرصہ عبدالرشید ترکستان کے علاقہ میں رہے پھر شہر تارا آئے اور اپنی بیوی اور بچوں کو قازان منتقل کردیا اور خود بہت لمبے سفر پر نکل گئے اور کبھی روس اقامت کی غرض

سے نہیں آئے، حالانکہ عمر بھر اپنے وطن کو یاد کرتے اور وہاں جانے کا شوق برابر ظاہر کرتے رہے، انہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کی حمایت، عثمانی سلطنت کے تحفظ اور روس کے مظالم کے خلاف لڑنے میں گزار دی، زندگی کے آخری ایام اپنی بیوی اور بچوں سے دور دیار غیر میں گزارے اور پیوند خاک بھی ہوئے، ۱۷راگست ۱۹۴۴ء کو ٹوکیو میں ان کی وفات ہوئی، یہ خبر سارے جاپان میں تمام ذرایع ابلاغ سے نشر ہوئی، ادھر اُدھر کے پڑوسی ملکوں کے ہزاروں افراد دفن میں شرکت کے لیے بے تاب تھے، اس لیے تدفین میں تین دن کی تاخیر ہوئی اور عقیدت مندوں، احباب ورفقا اور نومسلموں کا جم غفیر ان کے جنازے میں شریک ہوا اور ٹوکیو کے قبرستان میں جو شہر سے تقریباً ۳رکلومیٹر دور واقع ہے، دفن ہوئے۔

جاپان کا پہلا سفر اوپر گزر چکا ہے کہ صحافت سے عبدالرشید ابراہیم کا گہرا تعلق تھا، پیٹرس برگ میں انہوں نے صحافتی خدمات انجام دیں اور ۱۹۰۲-۱۹۰۳ء میں "آئینہ" کے نام سے ایک رسالہ نکالا، دوبارہ جب وہ جاپان گئے تو جاپان کی حکومت نے روس کی درخواست پر ان کو فوراً جاپان سے نکلنے کا حکم دیا لیکن جاپان میں موجودگی کے دوران انہوں نے عثمانی سلطان عبدالحمید کو جن سے انہوں نے ۱۸۸۴ء کو ملاقات کی تھی، ایک خط تحریر کیا کہ وہ جاپان میں اسلام کی اشاعت میں ان کی مدد کریں، سلطان عبدالحمید نے اس مکتوب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:-

روس پر جاپانیوں کی فتح سے کچھ عرصہ قبل جاپانی شہنشاہ کے خاندان کا ایک شہزادہ مجھ سے ملا اور اپنے شہنشاہ کا خط دیا جس میں ایسے علما جاپان بھیجنے کا مطالبہ کیا تھا جو اسلام وایمان کا مفہوم ومقصد اور اسلامی عبادتوں کی روح وفلسفہ کو وضاحت سے بیان کرسکیں، اس درخواست کا ایک سبب یہ تھا کہ مجھے قازانی الاصل عالم عبدالرشید ابراہیم کا ایک خط ملا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اسلام کا پھیلانا ایک مقدس فریضہ ہے، انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے مدد طلب کی تھی کیوں کہ میں مسلمانوں کا خلیفہ ہوں اور یہ امر میرے لیے باعث فخر ہے کہ میں اس شریفانہ کوشش کا خدمت گار بنوں، مجھ سے جو کچھ بن پڑا وہ کیا، میری روح اس خدمت کو انجام دینے کے لیے بے تاب رہتی ہے لیکن میری مدد مادی ومالی وسایل تک ہی محدود ہے، عبدالرشید ابراہیم ہمارے یہاں کے علمائے دین سے بالکل مختلف ہیں، وہ ترکی، فارسی، عربی کے علاوہ بہت اچھی

روسی اور جاپانی زبانیں جانتے ہیں، انہوں نے ۴۰رسال کے ہو جانے کے بعد فرانسیسی اور لیٹن زبان سیکھی [5]۔

عبدالرشید ابراہیم نے ۲-۱۹۰۱ء کے اپنے جاپان کے سفر کا تذکرہ اپنی کتاب ''عالم اسلامی'' میں نہیں کیا البتہ ۱۹۰۷ء کے سفر کا ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جاپانی تنظیم ''کالے ناگ'' سے ان کا تعلق تھا جو ۱۹۰۱ء میں قایم ہوئی تھی، اس کا دوسرا نام ''نہر اُموڈ'' سوسائٹی بھی ہے، اس کے ارکان چاہتے تھے کہ جاپان کی حدود ایشیا میں نہر اُمود تک پھیل جائے اور مشرقیت کو قایم و باقی رکھتے ہوئے مغربی ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا جائے لیکن اس تنظیم کے دستاویزات دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانی آرکائیوز سے غایب ہوگئے [6]۔

عبدالرشید ابراہیم اس تنظیم سے اپنا تعلق ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، انہیں ۱۹۰۵ء میں روس پر جاپان کی فتح کی بہت خوشی تھی، اس لیے کہ روس دونوں کا دشمن تھا، دوسری طرف ترکی الاصل قیدیوں سے جاپانیوں کا اچھا معاملہ بھی ان کو بہت پسند تھا، ان کا خیال تھا کہ روس اور مشرق اقصیٰ کے مسلمانوں کو مغرب سے نجات صرف جاپانیوں ہی کی مدد سے حاصل ہوسکتی ہے، اس وجہ سے اس خفیہ تنظیم سے ان کے تعلقات تھے جس کی کوئی دستاویز موجود نہیں، البتہ اس تنظیم کے قاید کے ساتھ ان کا ایک فوٹو پایا جاتا ہے اور بان کے قول کے مطابق وہ جاپانی جن سے ان کے گہرے مراسم تھے وہ سب اس تنظیم کے ممبر تھے۔

جاپان کی سیاحت

عبدالرشید ابراہیم کا سب سے زیادہ اہم سفر ۱۶ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو شروع ہوا جس میں انہوں نے تمام عالم اسلام کی سیاحت کی اور اس کا دل چسپ سفرنامہ مرتب کیا جس کو شیخ سامرائی ڈائریکٹر اسلامی سینٹر جاپان نے عربی میں منتقل کرایا اور بقول عبدالوہاب عزام (سابق سفیر سعودی برائے پاکستان) ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے بھی دل چسپ ہے [7]۔

عبدالرشید ۱۶ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو قازان سے چل کر نہری راستے سے اوفا پہنچے اور وہاں کچھ دن رہ کر ریل کے ذریعہ آپ چلی (Cheylatinsle) آگئے اور یہاں کچھ دن مقیم رہے، سائبیریا کے وسیع علاقے میں ریلوے لائن نہیں ہے، یہیں سے اس کی ابتدا ہوئی ہے، یہاں ترک مہاجرین سے مل کر ان کے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کی پھر وہ اومک، تومک، ارکوسک اور منگولیا سے گزرے،

منگولیا میں بدھوں کے بڑے راہب حامبالاما سے ملے اور بدھ مت اور ان کی کتابوں کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں، انہیں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بدھوں کی ایک لنوا ایک جلد پر مشتمل ایک کتاب میں اسلام کے بارے میں معلومات درج ہیں، کئی دن وہاں مقیم رہ کر وہ منشوریا پہنچے، وہاں سائبیریا کے تاتاریوں نے احترام وعزت کے ساتھ ان کا استقبال کیا، عبدالرشید اس علاقہ کے بعض شہروں میں گھومے پھرے، اس کے بعد خاربین شہر کا رخ کیا اور وہاں مقیم تاتاریوں سے ملاقات کی، وہاں سے پھر وہ ''ولاڈیوسٹک'' (Valadivostok) شہر پہنچے، اس کے بعد جاپان کے جہاز سے جاپان منتقل ہوگئے۔

جاپان کی سیاحت اس سفرنامہ کا اہم حصہ ہے پہلے وہ چھوٹے شہروں میں سفر کرتے رہے، اس کے بعد ٹوکیو منتقل ہوگئے، جہاں تقریباً سات ماہ مقیم رہے اور ہر فکر و خیال کے لوگوں سے ملاقات کی، ان کی گفتگو مترجم کی مدد سے ہوتی تھی، کچھ عرصہ بعد وہ باتیں سمجھنے لگے، انہوں نے جاپانی مدرسوں اور اسکولوں کو بہ غور خاص طور پر دیکھا اور جاپان کے نظام تعلیم کا قریب سے مطالعہ کیا اور جاپانی شہنشاہ کے ایک رشتے دار شہزادے ''امیر ایٹو'' سے ان کی بہت گہری دوستی ہوگئی، اس امیر اور اس کے خاندان کے واسطے سے جاپانی حکومت کے ممتاز ارکان سے بھی ان کا تعارف ہوا، اپنے دورہ میں ٹوکیو شہر کے آس پاس کے شہروں اور گاؤوں میں خوب آنے جانے سے جاپانیوں کے عادات واطوار سے ان کو اچھی واقفیت ہوگئی اور جاپانی زبان پر بھی عبور حاصل کرلیا کیوں کہ ان جگہوں میں وہ تنہا جاتے تھے اور لوگوں سے گفتگو کرنا ناگزیر ہوتا تھا، اس لیے جاپانی زبان سیکھنے پر بڑی توجہ دی، جاپان جانے کے کچھ عرصہ بعد وہاں ان کا زبردست استقبال ہوا، بہت سی جماعتوں اور سوسائٹیوں نے ان کو مدعو کیا اور ان کے اعزاز میں دعوتیں کیں، ان استقبالیہ تقریبوں میں وہ اسلام اور روس کے مسلمانوں کے حالات بہت تفصیل سے بیان کرتے، جب ان کی تقریریں اخبار اور رسایل میں چھپتیں تو لوگوں میں ان کا تعارف بڑھتا اور وہ ان سے ملنے آتے، ان ملاقاتوں اور کانفرنسوں کے نتیجہ میں بہت سے جاپانیوں نے اسلام قبول کیا جن میں حکومت کے بڑے عہدے دار بھی شامل تھے، ان لوگوں کی مدد سے عبدالرشید ابراہیم نے ایک جمعیت ''ایشین دفاعی قوت'' (Asya Gulkay) کے نام سے بنائی اور اسے اشاعت اسلام کا ذریعہ

بنایا، وہاں مشنریز کے لوگ اسلام، مسلمان اور نبی کریم علیہ ﷺ کے بارے میں جو غلط باتیں مشہور کرتے ان کا جواب عبدالرشید ابراہیم ایک مصری نوجوان احمد فضلی کے ساتھ مل کر تقریر اور تحریر کے ذریعہ دیتے اور لوگوں کو باور کراتے کہ یہ معترضین کا سراسر جھوٹ اور افترا ہے، ان مباحثوں کو جاپان ٹائمس (Japan Times) چھاپتا تھا اور جاپانی عوام پر اس کا زبردست اثر ہوتا تھا۔

یہ جمعیت [illegible] مئی ۱۹۰۹ء کو قایم ہوئی، ٹوکیو میں اس کے پہلے صدر ایک سیاسی رہنما اوھارا تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا اسلامی نام ابوبکر تھا، اس جمعیت کی اساس اس حدیث نبویؐ پر تھی کہ "کونوا عباد اللّٰہ اخوانا" اس کی ضروری شرط اور شعار سورہ اسرا کی مندرجہ ذیل آیت تھی واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا۔

جمعیت کے اندرونی نظام کے جایزے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خفیہ تنظیم تھی اور اس کے کاموں کا آغاز فروری ۱۹۰۹ء میں ایک رسالہ "وائیو" کی اشاعت سے ہوا تھا، جمعیت کے ٹوکیو کے ارکان نے مسجد کے لیے ایک قطعہ زمین حاصل کی جس کے بیع نامہ میں عبدالرشید ابراہیم کا نام درج کرایا گیا مگر وہ مسجد کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے جاپانی مسلمانوں اور عثمانی سلطان کے درمیان مستحکم رابطہ قایم کرنے کے لیے یہ مناسب خیال کرتے تھے کہ عثمانی خلیفہ کو بھی اس سے مطلع کر دیا جائے، چنانچہ انہوں نے استنبول سے شایع ہونے والے "صراط مستقیم" میں ایک مراسلہ تحریر کیا جس میں جامع مسجد قایم کرنے کا پورا پلان دے کر اس کے لیے چندہ طلب کیا گیا تھا مگر افسوس ہے کہ عبدالرشید ابراہیم کی یہ ساری کوششیں ناکام ہو گئیں، اس لیے انہوں نے زمین کی ملکیت ایک ہندوستانی تاجر کے نام منتقل کر دی تاکہ وہ مسجد کی تعمیر مکمل کرا دیں اور خود جاپان چھوڑ کر مکہ معظمہ پہنچنا چاہتے تھے، گو جاپان میں ان کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور وہاں روز بہ روز اسلام کی اشاعت بڑھ رہی تھی، اس لیے ان کا دل یہاں سے جانے پر راضی نہ تھا۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جاپان کے جو لوگ ان کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوئے وہ اعیان حکومت اور سربر آوردہ لوگ تھے، جیسے ریٹائرڈ پولس آفیسر، سفرا اور وزرا وغیرہ، عبدالرشید ابراہیم نے ان ہی لوگوں کی مدد اور اثر و رسوخ سے ایک زمین ٹوکیو کی مسجد کے لیے حاصل کر لی، حالانکہ ٹوکیو میں زمین بہت مہنگی تھی۔

عبدالرشید ابراہیم جن نیک جذبات و خیالات کو لے کر جاپان گئے تھے اگرچہ ان کی امنگیں اور آرزوئیں خاطر خواہ پوری نہیں ہوئیں تاہم جاپانیوں کی جو پوزیشن آج دنیا میں ہے اگر اس کو نظر میں رکھا جائے تو عبدالرشید کی دور بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے اور اگر ان کی کوششیں مکمل طور پر کامیاب ہوئی ہوتیں اور مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے بجائے چند ملین ہو جاتی تو غالب احتمال تھا کہ مسلمانوں کی پوزیشن آج عالمی سیاست میں بہتر ہوتی، عبدالرشید ابراہیم کی بغیر کسی معین و مددگار کے تن تنہا محنت تھی اگر ان کو عالم اسلام سے وہ مدد اور تعاون ملتا جو مغربی مشنریز کو اپنے ملکوں سے مل رہا ہے تو ان کو بہت زیادہ کامیابی ملی ہوتی۔

وہ ۱۵ر جون ۱۹۰۹ء کو ٹوکیو سے جب کوریا کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے تو ایک جم غفیر نے ان کو ٹوکیو اسٹیشن پر الوداع کہا اور شمو منیسکی ساحل تک راستے میں جتنے اسٹیشن پڑے سب جگہ ان کا پرجوش استقبال کیا گیا، ۱۹ر جون کو یہاں کی بندرگاہ سے وہ کوریا کے لیے روانہ ہو گئے۔

کوریا، چین اور سنگاپور کی سیاحت کرتے ہوئے ۱۹۰۹ء کے اواخر میں کلکتہ (ہندوستان) پہنچے، ہندوستانیوں کی مفلوک الحالی سے وہ رو پڑے اور انہیں اپنے ہم وطن یاد آ گئے، اس کے بعد بمبئی پہنچے، یہاں کے زمانہ قیام میں ان کے چند دوستوں نے ایک نوجوان (جو جاپانی تھا اور اس کا نام یاما اوکا تھا) کو ان سے ملایا جو مسلمان نہ تھے مگر ان کی تربیت سے مسلمان ہو گئے، انہوں نے ان کا نام عمر یاما اوکا رکھا، عبدالرشید نے اس نوجوان کو اپنے دوستوں کے پاس بمبئی میں چھوڑا اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی سیاحت کے قصد سے وہاں سے نکلے تو برطانوی حکومت نے گرفتار کر لیا کہ وہ بمبئی سے بغیر اجازت کیوں نکلے؟ کسی طرح دوستوں کی کوشش سے رہائی ملی تو انہوں نے ہندوستان گھومنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جاپانی نومسلم کے ساتھ ۷ر ستمبر ۱۹۰۹ء کو بمبئی سے حجاز کے لیے روانہ ہو گئے۔

۱۹۱۹ء میں جب وطن کی یاد نے بہت ستایا تو وہ استنبول سے مغربی ترکستان کے راستے اپنی جائے پیدائش تارا چلے آئے، چند دن آرام کیا، دوستوں نے ان کے بہت شدید انکار کے باوجود ان کی دوسری شادی کرا دی، وہاں کچھ دن رہ کر مغربی ترکستان کے راستے استنبول آ گئے، ساتھ میں بیوی اور تینوں بچے بھی تھے، استنبول بہت مہنگا شہر تھا، سوائے چند مخلص دوستوں کے ان

کا ہاتھ خالی تھا، اس لیے انہوں نے قونیہ ضلع کے ایک گاؤں میں جہاں ان کے علاقہ سائبیریا کے لوگ آباد تھے، ایک گھر لے کر اپنے بیوی بچوں کو چھوڑا اور خود مغربی ترکستان چلے گئے اور وہاں روس کے خلاف جاری جنگ میں ترکستان کی زبردست معنوی مدد کی، انہیں اس علاقہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا[8]۔

کچھ عرصہ ترکستان میں رہے اور پھر اسلام کے فروغ کے لیے جاپان آگئے، ان کے ایک خط سے جو انہوں نے اپنی بیٹی فوزیہ کو ۱۹۲۴ء میں تحریر کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روانگی سے قبل اتاترک سے ملاقات کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ مشرقی ترکستان کے حالات ان کو لکھیں گے، جاپان پہنچنے کے بعد انہوں نے اتاترک کو وہاں کی معلومات بہم پہنچائیں، اس خط میں عبدالرشید نے ذکر کیا ہے کہ جاپان ریڈیو ہر ہفتہ آدھا گھنٹہ صبح اسلام کے بارے میں ایک پروگرام پیش کرتا ہے۔

وہ روس اور جاپان میں تین ماہ رہ کر ۱۹۲۵ء کے اواخر میں ترکی واپس آئے، قونیہ جا کر کچھ وقت اپنے بیوی بچوں کے پاس رہے پھر استنبول جا کر ایک رسالہ نکالنا چاہتے تھے تا کہ اپنے ہم وطنوں پر ہو رہے مظالم کو واشگاف انداز سے پیش کریں لیکن حکومت سے اجازت نہیں ملی کیونکہ جمہوریہ ترکی اپنے پڑوسیوں سے اچھے تعلقات رکھنا چاہتا تھا، ان کو کہا گیا کہ وہ قونیہ لوٹ جائیں، وہ قونیہ واپس آگئے، چند دن آرام کیا لیکن عبدالرشید جیسا آدمی جس نے پوری زندگی جدوجہاد میں گزاری ہو وہ قونیہ میں مقید ہو کر کیوں کر رہتا جب کہ ان کے دوست اور شاعر عاکف اور عباس حلیم پاشا دونوں مصر ہجرت کر گئے تھے، ان دونوں نے بھی ان کو مصر آنے کی دعوت دی تھی، ان کی بیٹی بالطاء کا بیان ہے کہ انہوں نے ترکی اپنی خواہش و مرضی سے نہیں چھوڑا تھا بلکہ طرح طرح کے دباؤ کی وجہ سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، علاوہ ازیں وہ اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف خاموش نہیں رہ سکتے تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ خلافت کو باقی رکھنے کے زبردست حامی تھے۔

اس نقطہ نظر کے حامیوں اور اس کی ترویج کرنے والوں کے لیے جمہوریہ ترکی میں کوئی گنجائش نہیں تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ان نظریات نے حکومت کو بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا

جس کی بنا پر اس نے ان کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ یا تو خاموش اور پرسکون رہیں یا پھر ملک چھوڑ دیں ایسے وقت میں جب کہ ہر طرف مسلمانوں کے خلاف ظلم و تعدی کا بازار گرم ہو عبدالرشید ابراہیم خاموش کیسے رہتے؟ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے اواخر میں وہ مصر چلے گئے جہاں ان کے عزیز دوست جمع تھے، ان سے وہ عالم اسلامی کے مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے تھے، سردی شروع ہوتے ہی قاہرہ آجاتے اور یہاں کے اجتماعات میں حصہ لیتے، ان اخراجات کی کفالت شہزادہ عباس حلیم پاشا کرتے تھے، شہزادہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے عبدالرشید ابراہیم کے بڑے مددگار و معاون تھے، یہاں کے قیام کے دوران انہوں نے مصری اخبارات اور رسالوں میں کئی مضامین لکھے جس میں روسی مسلمانوں کے مسائل خاص طور پر زیر بحث لاتے، ان کے اکثر مقالے روزنامہ "السبیل" میں شایع ہوئے[9]

وہ ۱۹۳۴ء تک مصر میں رہے لیکن امیر عباس حلیم پاشا کی وفات کے بعد یہاں بھی قیام دشوار ہو گیا، امیر انتقال کے وقت کچھ رقم ان کے لیے مختص کر گئے تھے، اس میں سے کچھ گھر والوں کے گزر بسر کے لیے قونیہ بھیج دیا، مصر میں قیام کے دوران وہ ہر سال حج بیت اللہ کو جاتے اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں تمام مسلمان حجاج اور زائرین سے ملاقاتیں کرتے، ان سے عالم اسلام کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے، جاپان کے حجاج ان سے جاپان چلنے کے لیے اصرار کرتے جسے انہوں نے زیادہ مفید سمجھ کر منظور کر لیا اور ۱۹۳۴ء میں براہ ہند جاپان پہنچ گئے۔

عبدالرشید ابراہیم نے جاپان میں اپنی سرگرمیاں بہت تیزی سے شروع کیں اور ٹوکیو میں جامع مسجد بنانے کا پلان بنایا جس کے لیے زمین ۱۹۰۹ء ہی میں خریدی جا چکی تھی لیکن متعدد وجوہ سے ابھی تک وہ بن نہیں سکی تھی، انہیں بتایا گیا کہ مسجد بنانے کے لیے ۱۹۰۹ء میں جاپانی، ہندوستانی اور قازانی مسلمانوں سے چندہ کر کے جو رقم جمع کی گئی تھی وہ منجمد پڑی ہے، بہر حال ان کی سعی و کوشش سے مسجد کی تعمیر کا کام چار سال میں مکمل ہو گیا اور ۱۹۳۴ء میں ایک پر اثر اور باوقار جلسے میں اس جامع مسجد کا افتتاح ہوا۔

عبدالرشید ابراہیم مسجد کی تعمیر میں مشغول رہنے کے باوجود جاپانی اخباروں اور عبدالحیٔ قربان کی ادارت میں نکلنے والے قازانی رسالے میں برابر مضامین لکھتے رہے اور ساتھ ہی دینیات اور تاریخ کا درس بھی ٹوکیو میں مقیم تاتاری اور دیگر مسلمانوں کے بچوں کو دیتے رہے، اس

کے علاوہ اسلام پر سمینار اور جلسے اپنے گھر اور دوسری جگہوں پر ہفتہ کے معین دنوں میں کرتے تھے، کبر سنی اور خدمت اسلام کے گوناگوں کاموں کی وجہ سے انہوں نے ایک سکریٹری متعین کر لی تھی جو ان کے مختلف النوع کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

عبدالرشید ابراہیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جاپانی پارلیمنٹ سے اسلام کو بھی جاپان کا سرکاری دین تسلیم کرالیا، جب کہ ۱۹۳۹ء تک بدھ مت، عیسائیت، شنتو اور یہودیت ہی کو بطور سرکاری مذہب منظوری حاصل تھی، اس کی وجہ سے جاپانی مسلمانوں کو بڑی مشکلات پیش آتی تھیں، عیسائی مشنریز بھی اسلام اور مسلمانوں پر بے سروپا الزام لگاتی تھیں اور جاپان کے لوگ بھی اسلام قبول کرنے میں جھجک محسوس کرتے تھے، عبدالرشید ابراہیم نے پارلیمنٹ کے اپنے ممبر دوستوں اور بڑے سرکاری ملازمین کی مدد سے اس معاملے کو جاپانی پارلیمنٹ میں پیش کرایا اور ۱۹۳۹ء میں پارلیمنٹ کی اکثریت سے اسلام کو سرکاری دین کی حیثیت سے تسلیم کرالیا، حالانکہ شہنشاہ کے بھائی نے اس کی مخالفت کی تھی جس کے بعد پورے جاپان میں اسلامی تنظیموں کے قیام اور مساجد و مدارس کی تعمیر کی اجازت حاصل ہوگئی اور ترکی سفیر احمد خلوصی بیگ کی معاونت سے درسی کتب میں اسلام اور ترکوں سے متعلق تمام غلط مواد کی تصحیح کرادی اور دوبارہ صحیح اور اچھے انداز سے درسی کتب کی اشاعت کرائی۔

عبدالرشید ابراہیم ٹوکیو کی جامع مسجد میں امامت بھی کرتے تھے، ان کی کوششوں سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا، اس بنا پر نئی مسجد کی ضرورت محسوس ہونے لگی لیکن دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے سارے کام رک گئے، ٹوکیو میں مقیم قازان کے تاتاریوں سے ان کا قریبی تعلق تھا، جب ترکی میں عربی طرز تحریر سرکاری طور پر ممنوع کردیا گیا تو قازان کے تاتاری استنبول سے عربی رسم الخط کا ایک پریس خرید کر جاپان لے آئے اور دینی اور قومی لٹریچر عبدالحئی قربان علی کی نگرانی میں اس سے چھاپنے لگے، ایک رسالہ بھی اس سے چھپتا تھا، عبدالرشید ابراہیم کو طباعت کا اچھا تجربہ تھا اس لیے وہ اس کام میں مقدور بھر مدد کرتے تھے، وہ اب عمر کے اس مرحلے میں داخل ہوگئے تھے جس میں لوگوں کو آرام کی ضرورت اور کاموں میں دشواری ہوتی ہے تاہم اب بھی وہ اسلام کے فروغ کے لیے

فکر مند رہتے تھے، چنانچہ عربی اور انگریزی میں پرچے نکال کر جاپانیوں کو وہ اسلام کی دعوت دینا چاہتے تھے لیکن جنگ عظیم اور عمر کی زیادتی نے اس کا موقع نہیں دیا۔

بالآخر ۱۷ راگست ۱۹۴۴ء کو انہوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا، اللہ مغفرت فرمائے، آمین۔

جس مسجد کو انہوں نے بہت شوق و محنت سے تعمیر کرایا تھا، اسے ترکی سفیر برائے جاپان نے اس بنا پر ۱۹۸۵ء میں ڈھانے کا حکم دے دیا کہ اس میں زلزلے کی وجہ سے کمزوری آگئی تھی، ۱۹۹۲ء میں جب وزیر اعظم ترکی سلیمان ڈیمیریل جاپان تشریف لائے تو جاپانی صحافیوں نے ان سے پریس کانفرنس میں اس کے متعلق پوچھا، انہوں نے مسلمانوں کو خوش خبری دی کہ عن قریب مسجد اور اس کے ساتھ ثقافتی مرکز بھی قایم ہو جائے گا، عبدالرشید ابراہیم کے معتقدین کی یہ تمنا تھی کہ مسجد ان ہی کی تعمیر کردہ مسجد کے نمونے کی بنے تاکہ ان کی روح خوش اور مطمئن ہو، خدا کا شکر ہے کہ مسجد ۲۰۰۰ء میں مکمل ہوئی لیکن اس کے لیے شیخ صالح سامرائی اور مفتی ڈاکٹر سلیم الرحمن خاں ندوی اور ان کے معاونین نے بڑی محنت کی، آدھے اخراجات ترکی حکومت نے اور آدھے جاپان کے تاجروں نے برداشت کیے، فجزاهم الله خير الجزا۔

حوالے

۱ عبدالرشید ابراہیم، حیات، پیٹرس برگ، تاریخ درج نہیں۔

۲ دیناً الامراه المعاصرة، نادر دولت، استنبول ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۲۔

۳ دیناً الاسلام فی مطلع القرن العشرین، استنبول ۱۹۸۷ء، ص ۶۹۔

۴ ایم-اے کا تھیسس، بہ عنوان عبدالرشید ابراہیم، اسکالر تورک اوغلو گراں، پروفیسر ڈاکٹر نادر دولت۔ استنبول ۱۹۹۳ء، سامرائی نے ترکی سے عربی میں ترجمہ کرایا، مترجم کمال احمد خوجہ۔

۵ حوالہ سابقہ، ص ۱۶۔

۶ حوالہ سابقہ، ص ۸۲۔

۷ معارف، جون ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۰، معارف پریس، اعظم گڈھ۔

۸ ایم-اے کا تھیسس، ص ۴۲

۹ حوالہ سابقہ، ص ۴۳۔

☆☆☆

حافظ سخاوی کے سب سے پہلے گجراتی شاگرد

مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی

از:- ضیاء الدین اصلاحی

ہندوستان میں علم حدیث کا اصل فروغ نویں صدی ہجری کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ہوا، یہ وہ زمانہ ہے جب مصر وشام اور حجاز میں امام الحدیث حافظ محمد بن عبدالرحمان بن محمد سخاوی (م ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) کے فضل وکمال کا آفتاب نصف النھار پر تھا اور ان کے فیض وافادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ کو منور کررہی تھیں، مدینہ منورہ میں ان کے کمال نے نے علی نورٍ کا مرتبہ حاصل کیا، مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) رقم طراز ہیں:-

"ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا یعنی بحر عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہ وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر جا کر عکس انداز ہوئیں"[1]۔

اور گجرات میں بھی جس مبارک شہر کے مایۂ ناز شخص کو سب سے پہلے حافظ سخاوی کی بارگاہِ فضل وکمال میں باریاب ہونے کا فخر حاصل ہوا وہ اس کا پایہ تخت اور ملک کا مشہور شہر احمد آباد تھا اور یہاں کے وہ خوش قسمت شخص مولانا راجح بن داؤد تھے، مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"حافظ سخاوی کے تلامذہ میں سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں، ۸۹۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقے میں داخل ہوئے اور الفیہ حدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا"[2]۔

مگر گجرات اور احمد آباد کا یہ یگانہ شیخ ومحدث ایسے گوشۂ گمنامی میں چلا گیا کہ بہ قول حکیم مولانا سید عبدالحئی مرحوم (م ۱۹۲۳ء) سابق ناظم ندوۃ العلما:-

"افسوس ہے کہ ایسے باکمال شخص کی تصنیفات سے ملک محروم ہے اور کوئی کتاب ان کی اب نہیں ملتی، ۹۰۴ھ میں وفات پائی، احمد آباد میں دفن ہوئے مگر اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ان کی قبر کہاں ہے؟"[3]۔

آج ان کا نام اور تھوڑا بہت جو حال محفوظ ہے وہ ان کے شیخ واستاذ حافظ سخاوی کی دین ہے، اگر انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الضوء اللامع لاھل القرن التاسع" میں ان کے متعلق چند سطریں نہ لکھی ہوتیں تو ہندوستان اور گجرات کے لوگوں کو ان کا کوئی سراغ بھی نہ لگتا، ہم بھی ان کے بارے میں کوئی نئی اطلاع نہیں دینے جارہے ہیں تاہم الضوء اللامع اور اس کے حوالے سے جن لوگوں نے ان کے حالات وکمالات کی داستان سنائی ہے، اسی کو یہاں یہ کہتے ہوئے پیش کررہے ہیں کہ

در موسم گل گر بہ گلستاں نہ رسیدیم   از دست نہ دادیم تماشائے خزاں را

امید ہے کہ یہ اعادہ وتکرار لطف سے خالی نہ ہوگا۔

نام ونسب: مولانا کا نسب نامہ جس قدر ملتا ہے وہ یہ ہے:

راجح بن داؤد بن محمد بن عیسی بن احمد[4]۔

نسبتیں: الہندی، الگجراتی، الاحمد آبادی وطنی اور الحنفی مسلکی نسبتیں ہیں۔

خاندان: مولانا راجح ایک ذی علم گھرانے کے فرد تھے، ان کے خاندانی بزرگوں کے حالات مفقود اور ہماری دسترس سے باہر ہیں مگر اپنے والد کے متعلق خود مولانا راجح نے حافظ سخاوی کو بتایا تھا کہ وہ ایک فاضل شخص تھے اور ۸۷۲ھ/۶۸-۱۴۶۷ء میں ان کی وفات ہوئی[5]۔

علامہ سخاوی نے ان کے ایک چچا اور بھائی کا بھی تذکرہ کیا ہے، چچا کا نام سلیمان بن محمد تھا، یہ ۸۴۰ھ/۳۷-۱۴۳۶ء میں پیدا ہوئے، انہیں علم وفن سے اشتغال تھا اور بعض فنون میں ممتاز تھے، مولانا راجح نے ان سے استفادہ کیا تھا اور میری کتاب شرح الفیۃ الحدیث کے لکھنے میں انہوں نے اپنے بھتیجے کی معاونت کی تھی[6]۔

علامہ سخاوی نے مولانا راجح کے ایک بڑے بھائی قاسم بن داؤد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ۸۶۹ھ/۶۵-۱۴۶۴ء میں پیدا ہوئے، انہیں بھی علم وفن سے اشتغال تھا اور ان کا نام ان

کے چھوٹے بھائی مولانا راجح کے ساتھ آتا ہے اور یہ ان ہی کے ساتھ مکہ میں مجھ سے ملے تھے اور مجھ سے درس بھی لیا تھا اور شرح الفیہ کی نقل میں اپنے بھائی کی معاونت کی تھی[۷]۔

پیدائش: مولانا راجح ۹ رصفر ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء کو احمد آباد میں پیدا ہوئے[۸]۔

پرورش و پرداخت: مولانا راجح کی نشو ونما ان کے مولد احمد آباد میں ہوئی، وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، ابھی مکمل دو برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا تھا[۹]، اس لیے ان کی پرورش و پرداخت چچا کے سایہ عاطفت میں ہوئی ہوگی۔

تعلیم اور اساتذہ: مولانا راجح کی مکمل تعلیم احمد آباد میں ہوئی جو اس زمانے میں پایہ تخت ہونے اور سلاطین گجرات کی علم و ادب نوازی کی وجہ سے علما و اعیان کا مرکز تھا، ان کے حسب ذیل تین اساتذہ کا ذکر حافظ سخاوی نے کیا ہے:۔

محمود بن محمد مقری، حنفی، احمد آبادی: حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ شیخ فاضل محمود بن محمد مقری اپنے زمانے کے مشاہیر علما میں تھے، ان سے جن فضلائے روزگار نے استفادہ کیا ان میں راجح بن داؤد بھی تھے بلکہ راجح کے اصل استاد یہی تھے اور ان سے انہوں نے زیادہ استفادہ کیا تھا اور احمد آباد میں ان سے نحو، صرف، منطق اور عروض وغیرہ کی تحصیل کی تھی[۱۰]، ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں وفات پائی۔

مخدوم بن برہان الدین احمد آبادی: حافظ سخاوی کے بیان کے مطابق یہ بھی طلبہ کو درس دیتے تھے، راجح نے ان سے معانی و بیان کی کتابیں پڑھیں، امام سخاوی نے مولانا راجح کے حوالے سے ان کو عالم و فاضل کہا ہے، تقریباً ۴۰ برس کے سن میں ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں وفات پائی، انہوں نے ایک مدرسہ قایم کیا تھا، ان کا مدفن ان کے گھر اور مدرسہ کے درمیان تھا[۱۱]۔

محمد بن تاج حنفی احمد آبادی: یہ علما و طلبہ کو ہیئت و کلام پڑھاتے تھے، مولانا راجح نے بھی ان فنون کا درس ان سے لیا تھا، حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں مولانا راجح نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں اور اس وقت ان کی عمر تقریباً ۴۰ برس ہوگی[۱۲]۔

وطن میں رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا راجح نے حج بیت اللہ کیا اور وہاں امام الحدیث محمد بن عبدالرحمٰن بن سخاوی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے اور ان سے فیض یاب ہوئے جو شارح بخاری، صاحب فتح الباری حافظ ابن حجر احمد بن علی عسقلانی (م ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ھ) کے

اجل تلامذہ میں تھے، ان کا مختصر حال بھی قلم بند کیا جاتا ہے۔

محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد سخاوی: یہ ربیع الاول ۸۳۱ھ/۲۸-۱۴۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۸ر شعبان ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء کو وفات پائی، مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء) کے پہلو میں مدفون ہوئے، ان کے شیوخ کی تعداد چارسو سے زیادہ بتائی جاتی ہے، جن میں مکہ و مدینہ کے مشائخ اور شام کے علما بھی شامل تھے، محمد بن فہد المعروف بابن فہد مکی (م ۸۷۱ھ/ ۶۶-۱۴۶۷ء) ان کے خاص شاگرد تھے، کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت اور اس کے جوار میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔

سخاوی کی عظمت و جلالت کا اندازہ بعض علما کے اس قول سے ہوتا ہے کہ "حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) کے بعد ایسا فاضل و کامل شخص پیدا نہیں ہوا، ان کی وفات سے فن حدیث کی موت ہوگئی، امام شوکانی (م ۱۲۵۰/۱۸۳۴) کے خیال میں ان کی کتاب الضوء اللامع کو حافظ ابن حجر کی تصنیف الدرر الکامنہ پر ترجیح حاصل ہے، وہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور کتاب نہ بھی لکھتے تو تنہا یہی کتاب ان کی امامت و فضل کی دلیل تھی، کاش اس میں انہوں نے اپنے معاصرین اور کبار علما کی تنقیص اور عیب جوئی نہ کی ہوتی[۱۳]۔

مولانا راجح کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان کے استاذ و شیخ حافظ سخاوی نے ان کا اور ان کے تعلق سے ان کے چچا اور بڑے بھائی کا حال اپنی اس عظیم الشان کتاب میں کیا، انہوں نے اپنے شاگرد مولانا راجح بن داؤد سے اپنی ملاقات، ان کے تلمذ، جودتِ فہم، معقول و منقول میں ان کی دست گاہ کامل اور شعر گوئی سے ان کی مناسبتِ طبع وغیرہ کا حال اس طرح قلم بند کیا ہے۔

"راجح گجراتی ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں مکہ معظمہ میں مجھ سے ملے تھے، جب وہ اپنے بھائی قاسم اور چچا کے ساتھ حج کے لیے آئے تھے، حج وہ اس سے پہلے والے سال کر چکے تھے، اس کے بعد وہ روضۂ نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ گئے تھے، وہاں سے مکہ واپس آئے تو میری ملاقات کی اور مجھ سے میری مکمل کتاب شرح الفیۃ الحدیث[۱۴] پڑھی اور ربیع الاول میں اس سے فراغت حاصل کی اور میری مدح میں کچھ اشعار کہے، میں نے ان کو اہتمام سے ایک جامع و مکمل اجازت عطا کی جو تین چیزوں کے بقدر تھی، مولانا راجح تمام فنون میں ماہر تھے، انہوں نے مجھ سے بدر دمامینی[۱۵] کا

ترجمہ دریافت کیا تھا جو ان کو تحریر کرا دیا تھا، بدر کی وفات ہندوستان ہی میں ہوئی تھی، مزید برآں محمد[16] بن محمد بن العلا البخاری العجمی الحنفی کے ترجمے سے بھی ان کو آگاہ کر دیا تھا اور اس سے بھی خبردار کیا تھا کہ وہ ابن عربی[17] اور ان کے معتقدین کی تکفیر کرتے تھے، یہ تنبیہ اس لیے کی تھی کہ وہ اس سے فایدہ اٹھا کر ان کے معتقدین کا دفاع کر سکیں، کیونکہ ابن عربی کی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ ان سے بڑی عقیدت اور ان کی تصنیفات سے نہایت اشتغال رکھتے تھے"۔

جس زمانے میں مولانا راجح اور ان کے بھائی مجھ سے پڑھ رہے تھے، دونوں مجھ سے برابر چمٹے رہتے تھے، ان لوگوں نے بخاری شریف کے کچھ حصوں اور میری بعض دوسری تصنیفات کا سماع بھی مجھ سے کیا اور میں نے اپنی کتاب کے نسخے بھی ان کو دیے تھے[18]۔

حافظ سخاوی سے مولانا راجح کا استفادہ، شرح الفیہ کی اجازت حاصل کرنا اور صحیح بخاری کے بعض اجزا کا درس لینا ہی ان کی عظمت اور بلند پایگی کے لیے کچھ کم نہ تھا کہ مزید براں خود استاد بھی اپنے شاگرد کے فضل و کمال کا اعتراف بڑے شان دار لفظوں میں کر رہے ہیں، مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت کی شہادت دے رہے ہیں اور ان کے ذوق شعر و سخن کی داد دے رہے ہیں، اس کے بعد کس کو ان کی جامعیت و کاملیت، تبحر اور رسوخ فی العلم میں شک و شبہ ہو سکتا ہے، وکفی بہ فخرا۔

مولوی رحمان علی ناروی (م ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء) فرماتے ہیں:

در جملہ فنون تبحر پیدا کرد و طبع مایل بشعر داشت و اجازت الفیہ حدیث از سخاوی گرفتہ[19]۔	مولانا راجح تمام فنون میں متبحر تھے اور ان کی طبیعت کا میلان شعر کی جانب بھی تھا اور حافظ سخاوی سے الفیہ حدیث کی اجازت پائی تھی۔

یہ باکمال عالم و محدث جب حجاز سے حافظ سخاوی اور دوسرے اساتذہ فن سے فیض یاب ہو کر اپنے وطن احمد آباد واپس آیا تو قدر دانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی، ظاہر ہے جب وہ مسند درس پر رونق افروز ہوا ہوگا تو طلبہ اور علوم نبوت کے شیدائیوں کا تانتا اس کے درس میں لگ گیا ہوگا، اس کے قلم نے بھی اپنے جوہر دکھائے ہوں گے اور اس کی تحریروں نے علم و فن کے عقدے بھی حل کیے ہوں گے لیکن واحسرتا کہ آج نہ اس کی درس گاہ کا پتا ہے، نہ

طلبہ کے ناموں اور تعداد کا علم ہے، اس کی بھی خبر نہیں کہ اس نے کتنی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

وفات: مولانا راجح نے کم عمر پائی، ۳۳ برس کی عمر میں ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء میں وفات ہو گئی[20]، ان کے مدفن کا پتا نہیں۔

حوالے

[1] مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی: مقالات سلیمان حصہ دوم ص ۱۰، معارف پریس اعظم گڈھ طبع اول ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۸ء۔ [2] ایضاً ص ۱۱۔ [3] مولانا حکیم سید عبدالحئی: یاد ایام تاریخ گجرات، ص ۵۴، شاہی پریس لکھنؤ بدون سن۔ [4] محمد بن عبدالرحمان بن محمد سخاوی: الضوء اللامع ج ۳ ص ۲۲۲، مکتبہ القدسی قاہرہ، ۱۳۵۴ھ۔ [5] ایضاً ص ۲۱۶۔ [6] محمد بن عبدالرحمان بن محمد سخاوی: الضوء اللامع ج ۳ ص ۲۶۹ و ۲۷۰، مکتبہ القدسی قاہرہ، ۱۳۵۴ھ۔ [7] ایضاً ج ۶ ص ۱۸۰۔ [8] ایضاً ج ۳ ص ۲۲۲۔ [9] الضوء اللامع ج ۳ ص ۲۲۲ و جلد ۱۰ ص ۱۴۸، مکتبہ قدسی ۱۳۵۵ھ۔ [10] ایضاً ج ۱۰ ص ۱۵۰۔ [11] الضوء اللامع ج ۷، ص ۲۰۷۔ [12] ایضاً۔ [13] نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء): التاج المکلل من جواہر مآثر الطراز الآخر و الاول ص ۳۰۳، مطبع صدیقی بھوپال، ۱۲۹۸ھ۔ [14] الفیۃ الحدیث اصول حدیث میں حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی (م ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) کی مشہور کتاب ہے جو ابو عمرو بن عثمان بن عبدالرحمن المعروف بابن صلاح (م ربیع الاول ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء) کی کتاب علوم الحدیث یعنی مقدمہ ابن صلاح کی تلخیص ہے مگر عراقی نے اس میں اس پر بہت سے اضافے بھی کیے ہیں، حافظ سخاوی نے عراقی کی کتاب شرح فتح المغیث کے نام سے لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور اس فن کی جامع و محقق کتاب خیال کی جاتی ہے۔ [15] علامہ بدرالدین محمد ابن ابی بکر دمامینی القرشی المخزومی علوم ادب کے ماہر تھے، ۷۶۳ھ/۶۲-۱۳۶۴ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے، وہاں کے علما سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد قاہرہ میں سراج الدین بن ملقن (م ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء) وغیرہ سے سماع کیا، مکہ کے علما سے بھی استفادہ کیا، اسکندریہ کے متعدد مدارس کے علاوہ جامع ازہر مصر میں درس دیا، ایک سال یمن کی جامع زبید میں بھی مسند درس کو رونق بخشی، عربیت و ادب کے علاوہ فقہ میں بھی درک تھا، اسکندریہ و قاہرہ میں نایب قاضی مقرر ہوئے، دمشق میں قضائے مالکی پر مامور ہوئے، شعر اچھا کہتے تھے، کئی تصانیف یادگار چھوڑیں، جمال الدین ابو عبداللہ محمد بن عبدالسلام (م ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) جو ابن مالک کے نام سے مشہور ہیں اور نحو میں ان کی معروف کتاب

تسهيل الفوايد و تکميل المقاصد ہے، دمامینی نے اسی کی شرح التعليق الفرايد کے نام سے
لکھی تھی جو شرح التسهيل کے نام سے مشہور ہے، صحيح بخاری کی شرح مصابيح الجامع
کے نام سے لکھی، اس میں نحو و اعراب کے مباحث سے زیادہ تعرض کیا ہے، محمد بن موسیٰ کمال الدین (م ۸۰۸ھ/
۱۴۰۵ء) دمیری کی مشہور کتاب حياة الحيوان کا خلاصہ مختصر حياة الحيوان کے نام سے کیا تھا، یہ
تینوں کتابیں انہوں نے فرماں روائے گجرات سلطان احمد شاہ کے نام سے معنون کی تھی، دمامینی یمن سے سمندری
راستے سے گجرات آئے یہاں لوگوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور خوب استفادہ کیا، احمد آباد میں برسوں درس و
تدریس کی خدمت انجام دی اور یہیں ان کو تسهيل کا نسخہ بھی ملا تھا اور اپنے تلامذہ کی فرمائش پر اس کی شرح لکھی
تھی، شعبان ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء کو دکن کے شہر گل برگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے کہا جاتا ہے کہ انہیں زہر دیا گیا تھا
(الضوء اللامع کے علاوہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی بغية الوعاة، ابن عماد حنبلی (م ۱۰۸۹ھ) کی شذرات
الذهب، شوکانی کی البدر الطالع اور مولانا عبدالحی کی نزهة الخواطر میں بھی ان کے حالات درج
ہیں۔ ۱۶؎ علاء بخاری علامہ تفتازانی کے شاگرد تھے جو معقول و منقول میں دست گاہ کامل رکھتے تھے، علاء ۷۷۹ھ/
۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے، تصوف و ادب سے شغف تھا، علم و فن کی اشاعت کے لیے ہندوستان بھی آئے تھے پھر
مکہ و قاہرہ گئے، ابن عربی اور ان کے نظریہ وحدت الوجود کے مخالف تھے، ان کا انتقال ۸۴۱ھ/۱۴۳۷ء میں ہوا۔
۱۷؎ یعنی شیخ اکبر محمد بن علی ابوبکر المعروف بابن عربی اندلسی صاحب فتوحات مکیہ (ولادت ۵۶۰ھ/۶۴-۱۱۶۵ء،
وفات ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء)، یہ عجیب بات ہے کہ شیخ ابن عربی صوفیہ کے یہاں جس قدر مقبول ہیں اسی قدر فقہا و
محدثین کے حلقے میں مردود سمجھے جاتے ہیں، حافظ سخاوی نے مولانا راجح کو اسی لیے علاء بخاری کی تنبیہ سے آگاہ
کیا تھا اور خود بھی القول المنبی فی ترجمة ابن عربی کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی جس کا خلاصہ
ایک جز میں الكفايه فی طريق الهدايه کے نام سے کیا تھا، ان کی ایک اور کتاب تجريد اسماء
الآخذين عن ابن عربی بھی ہے (الضوء اللامع، ج ۸، ص ۱۷)۔ ۱۸؎ الضوء اللامع ج ۳،
ص ۲۲۲۔ ۱۹؎ مولوی رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۲ طبع اول، مطبع نول کشور، ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء۔ ۲۰؎ مولانا
سید عبدالحی حسنی: نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر، ج ۴، ص ۱۱۱، مجلس دائرة
المعارف العثمانيه، حیدرآباد، ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء۔

☆☆☆

اخبار علمیہ

عالم اسلام کے مشہور سافٹ ویر اداروں میں حرف، بلاغ اور النور وغیرہ نے قرآن، حدیث
اور فقہ وغیرہ پر بہت اچھے سافٹ ویر تیار کیے ہیں، ان اداروں میں مصر کی مشہور سافٹ ویر کمپنی
"حرف" نے حدیث پر "الكتب التسعة"، فقہ و اصول فقہ پر "جامع الفقه الاسلامی"
کے نام سے سافٹ ویر تیار کیا ہے، اس کی تیاری میں علما، انجینیر اور اسلامی ترقیاتی بنک جدہ کے
محققین نے خون جگر صرف کیا ہے، فقہ و اصول فقہ کی تقریباً سو امہات کتب کے حوالے ہی سے
اس سافٹ ویر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، فقہائے اربعہ کے علاوہ فرقۂ امامیہ اور زیدی مذہب کی
کتابیں بھی اس کے مصادر میں شامل ہیں، آيات الاحكام میں احكام القرآن (ابن
العربی)، احكام القرآن (جصاص رازی)، احكام القرآن (امام شافعی)، احاديث
الاحكام میں احكام الاحكام (ابن دقیق العید)، سبل السلام (ابن حجر)، شرح
معانی الآثار و مشكل الآثار (امام طحاوی)، نيل الاوطار (شوکانی)، نصب
الرايه (زیلعی حنفی)، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ، فقہ حنفی میں البحر الرائق شرح كنز
الدقائق، العنايه على الهدايه، المبسوط، بدائع الصنائع، رد
المختار على الدر المختار، تبيين الحقائق اور فتح القدير وغیرہ، فقہ مالکی میں
المدونه، المنتقى، حاشيه الدسوقی، مواهب الجليل وغیرہ، فقہ شافعی میں
كتاب الام اسنى المطالب، تحفة المحتاج، مغنی المحتاج وغیرہ کے علاوہ
دوسرے ائمۂ فقہ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، فتاوی عالم گیری، الفتاوی الكبرى
اور الموسوعة الفقهيه، کویت اور فقہا کے تراجم میں لکھی جانے والی کتابوں سے بھی اس
سافٹ ویر کی ترتیب و تیاری میں مدد لی گئی ہے، اس طرح یہ فقہ اسلامی کی انسائیکلو پیڈیا سافٹ ویر
ہے، یہ سافٹ ویر عربی ونڈوز کے علاوہ عام ونڈوز میں بھی داخل کیا جا سکتا ہے، سرچ (تلاش) کا

طریقہ یہ ہے، موضوع منتخب کرکے اس کے مطابق کل المراجع یعنی تمام مصادر کے بٹن پر کلک کریں تو مطلوبہ نتائج حاصل ہوجائیں گے، موضوعات کی فہرست فقہی ترتیب پر دی گئی ہے جیسے طہارت، عبادات، معاملات، اصول فقہ وغیرہ، اس سافٹ ویر سے کتب فقہ میں مذکور حدیثوں کے مدارج، فقہا کے دلایل واقوال اور قواعد کلیہ بھی معلوم کیے جاسکتے ہیں، عربی متن معرب ہے، جس کو چھوٹا بڑا بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کو دوسرے رسم الخط میں بھی تبدیل کرکے پڑھا جاسکتا ہے اور کاپی پیسٹ کرکے پرنٹ آؤٹ بھی ہوجاتا ہے، بازاروں میں اس کی سی۔ڈی بھی دست یاب ہے۔

ایران کے شہر "قم" کی آیت اللہ مرعشی نجفی لائبریری میں دس لاکھ مطبوعہ کتابیں ہیں اور ۶۵ ہزار سے زیادہ قلمی نسخے جن میں ۱۵٪ عربی اور باقی فارسی زبان کے ہیں، ترکی، اردو، تاتاری، پہلوی اور لاطینی زبانوں کے بھی کچھ نسخے ہیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے تحریر شدہ قرآن مجید کے ایک یا دو نسخے بھی ہیں مگر اس پر سنہ درج نہیں ہے، یہاں قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ ہے جس کی کتابت علی بن ہلال ابن بواب (۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء) نے کی ہے، شریف رضی کا مرتب کردہ نسخہ نہج البلاغہ ۴۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے، بعض کتابیں چوتھی صدی سے قبل کی بھی ہیں، متعدد زبانوں کے مطبوعہ ڈھائی ہزار رسائل اور بیرون ملک کے کتب خانوں کے قلمی نسخے بھی ہیں، پانچویں صدی سے اب تک کے ایک لاکھ سے زاید پروانے اور قدیم سکے بھی ہیں، لائبریری کے زیر اہتمام اب تک ۱۲ ہزار دو سو قلمی نسخے شایع ہوچکے ہیں، اس میں مخفی کیمرے لگے ہوئے ہیں اور یہ جدید ترین حفاظتی انتظامات سے آراستہ ہے، مائیکرواسکوپ اور مائیکروگرافی اور اصطرلاب کا جدید نظام بھی لائبریری کی قابل ذکر خصوصیات ہیں، سیکڑوں غیر ملکی، علمی و تعلیمی اداروں سے اس کے روابط ہیں، "ممنوعہ کتب" میں ملحدین کا لٹریچر اور مخالف اسلام تصنیفات درج ہیں، لائبریری کے صبح و شام کے اوقات ۴۰۰۰ طلبہ وعلما اور محققین کے لیے وقف رہتے ہیں، لائبریری کا ویب سائٹ درج ذیل ہے۔

www. maraDhilibrary. com (اخبار تحقیق)

جنوبی انگلینڈ کی ایک بحری کان میں برفیلے زمانہ یعنی ۵۰/ ہزار سال پہلے کے مادہ جانور کی کھوپڑی دریافت ہوئی ہے، جو ماہر استخواں نیول بالنگاتھ کے ذریعہ کوسٹ ورلڈ واٹر پارک میں ملی ہے، نیول نیچرل انوائرمنٹ ریسرچ کونسل، سوئیڈن سے وابستہ ہیں، ان کے بیان کے مطابق

کھوپڑی انتہائی خوش نما اور اس قدر صحیح وسلامت ہے کہ اس کی ہڈیاں بالکل نئی اور آج ہی کل کی طرح کی معلوم ہوتی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ادھر بیس برسوں میں قدیم حجری دور کی جس قدر چیزیں دریافت ہوئی ہیں ان میں یہ سب سے اچھی دریافت ہے، یہ ہڈیاں ہمیں اس وقت ملیں جب ہم اپنے رفیق کار مارک او، ڈل کے ساتھ بحری کان میں غوطہ زن تھے اور ان کا ملنا نعمت غیر مترقبہ ہے، ان کے خیال میں وہاں اس قسم کی اور چیزوں کے ملنے کے امکانات ہیں۔ (دی پوائنیر)

چکنی اور مرغن غذاؤں کے استعمال سے شریانوں کے بند ہوجانے کا خطرہ اور اس کا اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ بیماری دوسری موروثی بیماریوں کے مانند نہ ہوجائے لیکن کیلی فورنیا سے وابستہ مارگوٹیرائٹ اور ان کے ساتھیوں کی تحقیق کے مطابق وٹامن سی اور ای کے استعمال سے اس کا انسداد ممکن ہے کیوں کہ وٹامن کے استعمال سے شریانوں میں خون کی روانی بہتر ہوجاتی ہے اور ان میں جمود اور سختی نہیں آنے پاتی، جس کے سبب عارضۂ قلب کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔

ک ص اصلاحی

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت: دارالمصنفین، اعظم گڈھ — پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت: ماہانہ — نام پبلیشر: ضیاء الدین اصلاحی

نام پرنٹر: ضیاء الدین اصلاحی — اڈیٹر: ضیاء الدین اصلاحی

قومیت: ہندوستانی — قومیت: ہندوستانی

نام وپتہ مالک رسالہ: دارالمصنفین

میں ضیاء الدین اصلاحی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہے، وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

ضیاء الدین اصلاحی

☆☆☆

معارف کی ڈاک

۳۳ ردولی، بیگم گنج لکھنؤ
۱۸/جنوری ۲۰۰۴ء

''جاہلی عہد میں حنیفیت''

معارف کے شمارہ اکتوبر اور نومبر ۲۰۰۳ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کا ایک نہایت گراں قدر مقالہ بہ عنوان ''جاہلی عہد میں حنیفیت'' شائع ہوا جو ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی اہم فکری نشان دہی کر رہا ہے جس کی اس ملک کے موجودہ حالات میں اولین ضرورت ہے، یہ اس مقالے کا ایک ایسا اطلاقی پہلو ہے جس پر ہم کو موصوف کا احسان مند ہونا چاہیے۔

ہم نے اس پر ان غیر مبہم اصولوں کی روشنی میں غور کیا جو کسی تحقیق کو اعلیٰ ترین معیار پر لے جاتی ہیں اور اس منطق کے بھی تحت غور کیا جو تحقیق کے اصولوں کو غیر مبہم بناتی ہے اور ان کی صحت کی دلیل ہوتی ہے، فی نفسہ یہ موضوع فلسفۂ سائنس کا ہے۔

ان ہی دونوں حیثیتوں سے ہم نے اس مقالے پر غور کیا پہلے مؤخر الذکر کو لیجیے:۔

۱- (الف) کسی خیال، تصور (CONCEPT) یا اصطلاح کو زیر بحث لاتے ہوئے سب سے پہلے اسے اس کی ایک مخصوص تعریف یعنی (DEFINITION) میں لانا ضروری ہے، موصوف نے ایک واضح تعریف (OSTENSIVE DEFINITION) کی ہے، اس طرزِ تعریف کا استعمال نفسیاتی اور عمرانی علوم میں کیا جاتا رہا ہے، فاضل مقالہ نگار نے جس طرح اس طرز تعریف کی توثیق (VALIDATE) کی ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے، اس سے ہمیں اس ''گیرائی'' (COMPREHENSION) کا اندازہ ہوتا ہے جو اس تحریر کا ایک ممتاز پہلو ہے، واقعہ یوں ہے کہ ''گیرائی'' اس وقت ایک غیر معمولی

اہمیت اختیار کر جاتی ہے جب وہ علم کو آگے بڑھانے اور معلومات کو پختہ بنانے میں ممد و معاون ہو، موصوف کی تحریر کا یہی معاملہ ہے، ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام ذہن بالعموم سطحی طور پر سوچا کرتا ہے کیوں کہ گہرائی میں جانا اس کے بس میں نہیں ہوتا، اس طرح کسی تصور یا اصطلاح کی غلط تعبیرات (WRONG CONNOTATIONS) ایک روایت بن جاتی ہیں اور عام ذہن اس کو بلاچون وچرا درست سمجھ کر اسے ایک ذہنی عادت بنالیتا ہے، عموماً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دور جاہلیت میں یکا یک اسلام کی روشنی نمودار ہوئی جس کا کوئی پس منظر نہیں ہے، موصوف کا لائق صد تحسین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت دقت نظر اور کاوش سے وہ تمام حقائق جمع کر دیے جو گو دیگر علما کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن منتشر اور بکھری ہوئی شکل میں ہیں، یہ ان کی تحریر کا انوکھا پن (ORIGINALITY) ہے جو شروع سے آخر تک نمایاں ہے۔

۲- (ب) کسی معیاری اور اعلیٰ تحقیق کا ایک پہلو توضیح (EXPLANATION) بھی ہے، فاضل مقالہ نگار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ توضیح میں خیال آرائی (SPECULATION) سے کام نہیں لیتے بلکہ تمام تر واقعاتی پہلو پیش کرتے ہیں جو شبہ سے بالاتر ہوتا ہے، چنانچہ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ موصوف کے یہاں توضیح کا پہلو بالکل محفوظ (SAFE) ہے، اس لیے اس میں متضاد باتوں کی گنجایش ہی نہیں رہ جاتی جس سے نفس موضوع پر دلالت کرنے والے اثرات معدوم ہو جائیں، توضیح میں واقعاتی (FACTUAL) طریقے کی مثالیں مقالہ نگار کے یہاں قدم قدم پر ملتی ہیں لیکن ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے، وہ لکھتے ہیں:۔

> ''خاندانِ بنی عبد مناف کے بانی اور رسول اکرم ﷺ کے ایک جد اعلیٰ عبد مناف بن قصی جن کا اصل نام مغیرہ تھا، لوگوں کو اللہ کے تقویٰ اور صلۂ رحمی کا وعظ دیا کرتے تھے اور وصیت کرتے تھے: ''ان المغیرۃ بن قصی اوصی قریشا بتقوی اللّٰہ وصلۃ الرحم'' یہ ایک کتاب سنگ میں لکھی ہوئی یا نقش کی ہوئی وصیت بیان کی جاتی ہے اگر چہ اس کو ضعیف روایت مانا گیا ہے (بلاذری، ۵۲/۱)، البتہ بعض اہل قلم نے پوری صحت و التزام کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے دادا جناب عبد المطلب بن ہاشم توحید الٰہی کے قائل تھے اور بہت سے عقاید

اعمال دین ابراہیمی پر عمل پیرا بھی تھے، ان روایات کا روایتی و درایتی پایہ کمزور ہے، ایک
تاریخ داں کا واضح بیان ہے کہ انہوں نے بتوں کی عبادت ترک کردی تھی اور اللہ عز وجل
کی توحید کے قایل تھے: " ورفض عبادة الاصنام ووحد الله
عز وجل ...... فكانت قريش تقول: عبد المطلب ابراهيم
الثاني ...... ووفى بالنذر وسنّ سُنَناً نزل القرآن باكثرها و
جاءت السنة من رسول الله ﷺ بها ......" (یعقوبی، تاریخ، بیروت،
۱۹۶۰ء، ۲/۱۰، مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار راقم کی کتاب "عبدالمطلب ہاشمی۔
رسول اکرم ﷺ کے دادا" غیر مطبوعہ)۔ (معارف، اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۹ و ۲۶۰)

یہ تحریر تحقیق کے ایک اعلیٰ معیار کی حامل ہے، انہوں نے بلاذری کے خیال کو برطرف (SET ASIDE) کر کے اور بات کو نتیجہ آموز (CONCLUSIVE) بنا کر اعلیٰ معیار کا مزید ثبوت فراہم کیا ہے، یہ ان کے گہرے اور وسیع مطالعہ کا ثبوت ہے جس کے بغیر یہ تحقیق ممکن نہ تھی، کوئی دعویٰ یعنی (THESIS) یا (CONTENTION) کسی بھی مضمون کا یا تو عیاں (EXPLICT) ہوگا یا نہاں (IMPLICIT) ہوگا۔

۳- (ج) فاضل مقالہ نگار کے یہاں دعویٰ بالکل عیاں ہے کہ "عہد جاہلیت میں حنیفیت" اور وہ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی اجتماعی شکل بھی موجود تھی، چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں چند قبایل کا ذکر کیا ہے اور چوں کہ جملہ ذیلی دعووں میں عربی متن بھی نقل کیا ہے، اس لیے ان کی صحت کی پختگی (AUTHENTICITY) مسلم اور از خود عیاں ہے، (SELF EVIDENT) یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی عبارت سلجھی ہوئی ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں مثلاً:

عبادات اور اس کے ذیلی عنوانات (CATEGORY) یعنی (SUB CATEGORY) میں حج، نماز، زکواۃ، روزہ وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

اعمال کے تحت تحنث در رمضان، ختنہ، غسل جنابت، اللہ کے نام پر ذبیحہ اور شراب و نشہ آور اشیا سے پرہیز، غرضیکہ جہاں تک (EVIDENCE) کے اصول کا معاملہ ہے، موصوف کے یہاں

عبارت اس خاصہ کی حامل ہے جو سائنس کی زبان کا ہوتا ہے، اطلاقی پہلو سے بھی مقالہ پر نظر ڈالیے تو اس کی یہ غیر معمولی اہمیت سامنے آتی ہے جس کو سمجھ کر ہم دیگر مذاہب سے اپنے تعلقات کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

عرب کے قبایلی معاشرے کے مزاج کو ہم نے اس مضمون کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا، اس معاشرے میں وہ پوشیدہ صلاحیت (POTENTIAL) اچھی طرح موجود تھی جو ظہور نبوتؐ کے ساتھ ایک شکل (ACTUALITY) میں تبدیل ہوتی چلی گئی، اس بات سے ہماری سمجھ میں اسلام کا ارتقائی عمل یعنی (EVOLUTIONARY PROCESS) بہ خوبی آجاتا ہے، ایک اہم نکتہ اس سبق آموز مقالے میں یہ پوشیدہ ہے کہ کیا وہ "حنیفیت" جس نے ظہور نبوتؐ کے بعد ایک مخصوص وقت میں سارے عرب کو ایک وحدت میں سمیٹ لیا، اس قبایلی معاشرے کا بنیادی مزاج تھا؟ یا پھر بنیادی مزاج وہ تھا جو مسلسل خوں ریزی کی شکل میں ملتا ہے،" ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر فاضل مقالہ نگار کی اس تحریر کو عمرانیات (SOCIOLOGY) کے مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا جائے تو اس کے نتایج خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی بہت دوررس نکلیں گے"۔

ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس کے بنیادی مزاج کو ہمیں سمجھنا ضروری ہے، ہندوستان میں خصوصاً ویدک دھرم سے وابستہ لوگ جس مزاج کے حامل ہیں اس کی تہ میں وحدت کا تصور سرایت کیے ہوئے ہے اور یہ بات مسلم الثبوت ہے اور اس دھرم کے لوگ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کو ان کی ان روحانی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے جن کو ویدک دھرم نے دیا ہے، یہ دونوں باتیں بہت خوش آیند ہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر اب تعلقات کا استوار ہونا ضروری ہے، چنانچہ اس معاملہ میں فاضل مقالہ نگار نے ہمارے لیے (GUIDELINES) یقیناً فراہم کردی ہیں، ان کی روشنی میں ہم کو اپنے برادران وطن کا مزاج سمجھنا ہوگا، ان کو تصور وحدت اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔

چاروں ویدوں کے درجنوں اشلوک، گیتا کے دوسرے ادھیائے میں جہاد کا تصور، اس میں آخرت کی بہتر زندگی کا تصور اور متعدد دیگر باتیں ہمیں کچھ بتا رہی ہیں جس میں اولاً یہ ہے کہ لکل قوم ہاد "یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہدایت ربانی ان کتابوں میں موجود ہے، یہاں

وہی اسپرٹ کام کرے گی جس کو اس طرح بیان کیا ہے ”تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم“، قرآن صراحت سے بتا رہا ہے کہ ہم کو بہت سے انبیا و رسُل کے نام نہیں بتائے گئے لیکن ہم کو ویدوں، گیتا اور اُپنشدوں کی روشنی میں حسن ظن سے کام لینا ہوگا۔

اس حسن ظن کے لیے ہمیں جو (GUIDELINES) فاضل مقالہ نگار نے اپنے گراں قدر مضمون میں فراہم کردی ہیں، اس کے لیے ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق کی وہ راہ کھول دی جس کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔

احقر
معز علی بیگ

دارالمصنفین کا سلسلۂ مکاتیب

مکاتیب شبلی حصہ اول: مرتبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے ان خطوط کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے اور جن میں ملکی، قومی، مذہبی، علمی مسایل اور علامہ کے اصلاحی خیالات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ قیمت ۴۰؍ روپے

مکاتیب شبلی حصہ دوم: مرتبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کے ان خطوط کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے نام لکھے اور جن میں زیادہ تر ان کے علمی، تعلیمی اور اصلاحی خیالات درج ہیں۔ قیمت ۳۵؍ روپے

برید فرنگ: از مولانا سید سلیمان ندویؒ، وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے جب سید صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں سے ہندوستان کے اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو جو خطوط لکھے، یہ ان کا مجموعہ ہے جو بڑا معلومات افزا اور دنیائے اسلام کے اکابر رجال سے ان کی ملاقاتوں کی دل چسپ روداد ہے۔ قیمت ۳۵؍ روپے

مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی: یہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام مولانا الطاف حسین حالی، میر اکبر حسین الہ آبادی، مہدی حسن افادی، سید حسین بلگرامی، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کو دارالمصنفین نے اہتمام سے شایع کیا ہے۔ قیمت ۴۵؍ روپے

☆ ☆ ☆

مطبوعات جدیدہ

محمد رسول اللہ ﷺ: از ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم/ مترجم جناب نذیر حق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۸، قیمت: ۱۰۰؍ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی-۲۔

علوم اسلامیہ کے فاضل جلیل ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی یہ کتاب عرصہ ہوئے انگریزی زبان میں شایع ہوئی تھی اور اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے متعدد اڈیشن شایع ہوتے رہے، زیر نظر کتاب اسی کا اردو قالب ہے، ڈاکٹر صاحب کی ہر تحریر کا مقصد احقاق حق و ابطال باطل اور اسلام کا اثبات و اظہار بتایا جاتا ہے جس سے ان کے کلامی ذہن و مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مدۃ العمر اسلام کی تبلیغ اور مخالفین کی تردید سے سروکار رکھا، مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا جواب اس سلسلے میں سب سے اہم ہے جن کی روز اول سے یہی کوشش رہی کہ داعی اسلام کی شخصیت میں شکوک و شبہات کے ذریعہ آپؐ کے پیغام رسالت کی اہمیت سے صرف نظر کیا جائے، سیرت کے موضوع پر بے شمار و بے مثال تحریروں کی موجودگی میں اس کتاب کے لکھنے کا محرک شاید یہی جذبہ تھا کہ مستشرقین اور معاندین اسلام کے اعتراضات کو نظر میں رکھ کر ان کی تدلیسات و تلبیسات کا شافی رد و ابطال کیا جاسکے، آغاز ہی میں یہ احساس بہت اہم ہے کہ رسول عربیؐ کے سوانح نگار کو دستاویزات کی کمی سے نہیں، کثرت کے باعث مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ آپؐ ایک مکمل دینی نظام کے بانی اور ایسے راہ نما تھے جو اپنی تعلیمات کی بنیاد نزول وحی پر استوار کرتے تھے، اس کے علاوہ آپؐ بیک وقت ایک حکمراں، قانون ساز، فاتح، سالک اور معلم اخلاق بھی تھے، اس کتاب کے مضامین میں یہی روح کارفرما ہے، قریب پندرہ ابواب میں سیرت طیبہ کا ہر گوشہ سمیٹ لیا گیا ہے، خصوصاً باب دوم میں نیا دین کیوں کے زیر عنوان بحث مختصر ہونے کے باوجود بڑی جامع ہے جس میں عہد رسالت کے معاصر مذاہب کا بڑا معروضی جایزہ لیا گیا ہے، برہمنیت اور بودھ مت کی بحث خاص طور پر دل چسپ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ ہندوستانیوں کو تو ضرور جانتے تھے مگر یہ کہنا محال ہے کہ وہ ہندوستان کے مذہب کے بارے میں بھی کچھ جانتے تھے، مہابھارت اور گیتا کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ کیا انجیل میں مذکورہ قضاۃ (خداوند کی جنگوں) کی کتاب (تعداد ۱۴-۲۱) کو ان دونوں کتابوں میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے، اسی طرح گوتم بودھ کو ذوالکفل اور التین (انجیر) کو بڑ کے درخت کے تعبیر کرنے کی بعض مفسرین کی رایوں کو تائیداً

نقل کیا گیا ہے حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ ذوالکفل کے بارے میں قرآن و حدیث میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، اس قسم کی راویوں کا اعادہ باب-۹ خارجہ تعلقات میں بھی کیا گیا ہے، فاضل محقق کی بعض رائیں عام مورخین سے مختلف ہیں، مثلاً شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر مبارک میں ۴۰ سال کی معروف روایات کے برخلاف، ان کے نزدیک راجح ۲۸ سال والی روایتیں ہیں، انہوں نے اس حیاتیاتی حقیقت کو دلیل بنایا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے آنحضورؐ کے سات بچے ہوئے، اسی طرح وحی کے پہلے نزول کو ۲۷ ر رمضان المبارک کی بجائے وہ ۱۷ ر رمضان کو راجح مانتے ہیں، حضرت جبرئیلؑ کی آمد اور اقرا باسم ربک والی روایت کو انہوں نے حالت نوم کی کیفیت بتایا ہے، اسی طرح اس پہلی وحی کے نزول کے بعد جب آپ گھر تشریف لائے اور کپکپی کی وجہ سے کمبل ڈالنے کی فرمائش کی تو اس کی ایک وجہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک دسمبر کی سرد رات بھی تھی، ایسے ہی مستحقین زکوۃ میں مساکین میں غیر مسلم نادار لوگوں کو اور ابن السبیل کی تشریح مسافروں یا سیاحوں کے سڑک، پل، پولیس اور صحت وصفائی کے انتظامات سے کرنا بھی ڈاکٹر صاحب کے تفردات میں ہے، کسریٰ ایران کے نام نامہ نبوی کا پارہ پارہ کیا جانا بھی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک درست نہیں، امرؤالقیس کے قصاید کو بھی وہ درست نہیں سمجھتے بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ امرؤالقیس اس زبان سے نابلد تھا جو سبعہ معلقات میں استعمال کی گئی ہے، رسول اللہؐ کی تاریخ وصال ان کے نزدیک ۲ ربیع الاول ہے، معراج کو بھی وہ منامی ہی مانتے ہیں، عام خیال کے برعکس فاضل مصنف کے نزدیک عرب معاشرے میں خواتین کو نہایت بلند مقام حاصل تھا، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کے واقعات ان کے نزدیک نہ ہونے کے برابر ہیں اور اگر کچھ ہیں بھی تو ان کی وجہ عورت کی حد سے بڑھی ہوئی تکریم کا رجحان ہے، فتوحات مکیہ اور بعض دوسری کمزور روایتوں کا سہارا بھی لیا گیا ہے لیکن شاید یہ نفس مضمون اور نفسیات مخاطب کے زیر اثر ہے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر لفاظی، مبالغہ آرائی اور جذباتی لب ولہجہ کے نقایص سے مبرا ہے، ترجمہ بھی سلیس اور رواں ہے، کہیں کہیں لائق مترجم نے ضروری حواشی بھی دیے ہیں البتہ صفحہ ۹ پر اس عبارت میں ہے کہ "ابن قتیبہ تو بازنطین (استنبول) کے ساتھ اپنے تعلقات کا بھی ذکر کرتا ہے، بظاہر اس کا تعلق تھیوڈوسس اول (۳۹۵-۳۷۹) سے معلوم ہوتا ہے"، اصل عبارت Ibn Qutaiba speaks of his relations even with Byzantium میں His کی ضمیر ابن قتیبہ کی جگہ قصی کی جانب راجع ہے، صفحہ ۳۵ پر حضرت جبئیلؑ کے ایک قول کی ترجمانی میں حفظ مراتب کا فقدان صاف نظر آتا ہے، بعض صحابہ کرام کے ذکر میں ادب کا لحاظ ضروری تھا۔

غزل تنقید (ولی دکنی سے اقبال اور مابعد اقبال تک) اول و دوم: مرتبہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات بالترتیب ۴۵۰، ۵۷۶، قیمت: ۳۰۰ و ۴۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی

مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

ولی دکنی سے افتخار عارف تک قریب پچاس غزل گو شعرا کے کلام کا انتخاب اور اس کا یہ فنی اور معنوی تجزیہ اس لحاظ سے واقعی اہم ہے کہ اس سے پہلے اتنی مفصل اور جامع کوئی اور تنقیدی کوشش نظر نہیں آتی، فاضل مرتب کے رسالہ نقد و نظر کے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اس کی ابتدا ہوئی اور قریب ہر شمارے میں اس کا التزام و اہتمام جاری رہا، زیر نظر دونوں جلدوں میں ان مضامین کو سلیقے سے یکجا کر دیا گیا ہے، پہلی جلد میں ولی دکنی سے حالی تک اکیس شعرا کی غزلیں ہیں اور قدرتاً میر و غالب کی غزلیں تعداد میں اوروں پر غالب ہیں اور نصف سے زیادہ غزلوں کا تجزیہ خود مرتب کے قلم سے ہے، اسلوب صاحب کا خود ایک جدا اور منفرد اسلوب ہے، فکر و نظر کی مشرقیت کے باوجود ان کے زاویۂ نقد اور انداز فکر پر مغرب کی چھاپ نمایاں ہے، مغربی اصطلاحات اور تعبیرات کی کثرت سے ان کے اسلوب کی شناخت ہوتی ہے، وہ غزل کے مزاج داں ہیں اور خوب واقف ہیں کہ غزل کے تجزیے کا تقاضا ہے کہ اس کی گہرائی میں ان عناصر کی یافت و تعیین کی جائے جن میں تفکر و تعمق کے ساتھ جذبات و واردات کی شدت بھی پائی جاتی ہو، غزل نیم وحشی نہیں بلکہ سوفسطائی آرٹ فارم ہے، غالب و اقبال اسی لیے ان کے محبوب شاعر ہیں کہ ایک نے شعری عمل کو تفکر و استغراق کے عمل سے گزارا تو دوسرے نے مروجہ غزل سے انحراف کر کے ماورائی نسبتوں سے رشتہ قایم کیا، ان کے نزدیک جدید غزل گوئی پر اقبال کا اثر بڑا دور رس ثابت ہوا، فیض و مجروح حتی کہ امین اشرف و افتخار عارف اور ان سے بھی زیادہ جدید شعرا، غیر شعوری طور پر ہی سہی، غزل میں اقبال کے اجتہاد کے رہین منت ہیں، افتتاحیے میں ان خیالات کے اظہار سے انہوں نے غالب اور مابعد اقبال کی غزل گوئی کے مطالعے و تجزیے کے لیے گویا ایک خضر راہ نما کا تعین کر دیا، نقی حسین جعفری، قاضی جمال حسین، سید امین اشرف، سید عاصم علی، قاضی افضال حسین، مقبول حسن خاں اور شافع قدوائی وغیرہ تجزیہ نگاروں میں اسلوب صاحب کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے جنہوں نے غزلوں کے متن اور محاسن و نقایص کی تشریح و وضاحت میں فنی باریک بینی کے علاوہ سخن فہمی کی عمدہ روایت کی پاسداری بھی کی ہے، البتہ اسلوب جدید کی تازہ کاری شاید سخن فہموں کے اس طبقے کے لیے اتنی خوش گوار نہ ہو جو غزل کی تشریح بھی غزل کی طرح دل کش اور خوبصورت پیرایے کی عادی ہے، سودا کی ایک مشہور غزل کا تعارف اس طرح کیا گیا کہ "یہ غزل مکمل طور پر خود مکتفی ہونے کے علاوہ ایک طرح کی داخلی شعری منطق کا مظہر بھی کہی جا سکتی ہے" یا یہ کہ "کلام میر کی پرفریب سادگی، قاری سے غور و فکر کے ساتھ ہی شعری روایت سے گہری آگہی کا تقاضا کرتی ہے"، تاہم اس سے انکار نہیں کہ تجزیوں کی علمی سطح یقیناً بہت بلند ہے اور یہ بھی درست ہے کہ موجودہ عہد تک اردو غزل کے سفر کے مختلف مدارج و منازل کی ایک تصویر بھی سامنے آجاتی ہے افسوس ہے کہ اس قابل قدر کتابت کی پروف ریڈنگ پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی، پہلی جلد میں تو کمپوزنگ کی

غلطیاں سخت تکلیف دہ ہیں جس کا احساس دوسری جلد کے افتتاحیہ میں فاضل مرتب کو بھی ہے، بہر حال اردو شاعری خصوصاً غزل کے شیدائیوں کے لیے اس کتاب میں لطف ولذت کے علاوہ فکرو احساس کا بھی بڑا سرمایہ ہے، سخن فہمی کی روایت کی توسیع بجائے خود ایک بڑی مفید اور قابل تحسین سعی ہے، اس کی قدر ضرور ہونا چاہیے۔

برگ گل: از پروفیسر سید مقبول احمد مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۶، قیمت: ۲۰۰/روپے، پتہ: قاضی سید مہتاب احمد حسینی ایڈوکیٹ، ۲۵۹/الکا مینشن، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔

مسلم یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر، مرکز مطالعات مغربی ایشیا کے بانی، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے فعال ڈائرکٹر اور المسعودی کے محقق اور خود جغرافیہ کے ماہر کی حیثیت سے پروفیسر سید مقبول احمد کا نام علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، چند دہائیوں قبل ان کے بعض مذہبی اور سیاسی خیالات بھی موضوع بحث بنے، ۱۹۹۸ء میں انتقال ہوا، افسوس ہے کہ ان کی مجسم علم، شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اب تک نہیں لیا گیا لیکن ان کی اس خودنوشت سوانح نے خود اس ضرورت کو بحسن وخوبی پورا کردیا ہے، جس میں ان کے خاندان، عہد طفلی اور دور شباب کی داستان کے علاوہ ان کے تعلیمی اسفار کا تفصیل سے ذکر ہے، یورپ، افریقہ اور ایشیا کے اکثر ملکوں سے ان کا رابطہ اور مشاہدہ رہا، انہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا اس کو بڑی سادگی، سچائی اور ہمت سے اس طرح بیان کردیا کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں لذت کے ساتھ بصیرت کا بڑا سامان مہیا ہوگیا، خصوصاً نئی نسل کے لیے اس میں سیکھنے، پانے اور کچھ کردکھانے کی اور صحیح معنوں میں علم وعمل کی داستانِ عشق ہے، ان کا بچپن بھوپال اور لڑکپن ممبئی میں گزرا، انگلستان کے سفر کو انہوں نے علم وفکر کی معراج قرار دیا، مسلم یونیورسٹی ان کا اصل میدان عمل رہی، کشمیر اور جامعہ اسلامیہ میں ان کی شامِ زندگی گزری، اس متن کی تشریح بس پڑھنے کے لائق ہے جس میں ضمناً ان کے عہد کی ہر نمایاں تحریک کا ذکر آگیا ہے، آکسفورڈ میں انہوں نے المسعودی کی مشہور تصنیف مروج الذہب کا ترجمہ بھی کیا اور تھیسس بھی مکمل کی، اس کی تیاری میں وہاں کے ماحول اور اساتذہ کے رویہ کی تصویر کشی، مشرق کے دانش کدوں کے لیے سرمایۂ عبرت وبصیرت ہے، علی گڑھ کا ذکر قدرتاً زیادہ تفصیل سے ہے، وہ علی گڑھ برادری کے تصور کے ختم ہونے پر ملول بھی ہوئے کہ اب یہاں ہر شخص نفسی نفسی میں مبتلا ہے، اس عظیم ادارے کی فلاح و بہبود کا بہت کم لوگوں کو خیال ہے، علی گڑھ کی سب سے نمایاں خوبی ان کے نزدیک وہاں کی لائبریریاں ہیں جن کی نظیر ان کو ہندوستان میں کہیں اور نہیں ملی، اسی سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے مشہور ترانے کی دھن ان ہی کے ہارمونیم پر تیار کی گئی، ان کے سیاسی خیالات بھی واضح ہیں مثلاً بیسویں صدی میں یہ سوچنا کہ دنیا میں اسلام ازم پھر سے زندہ

ہوجائے گا، محض خواب وخیال کی باتیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ بعض اسلامی ممالک اسلام کی آڑ میں اپنے ظلم و تشدد اور ہر طرح کی جا و بے جا حرکتوں پر پردہ ڈالتے ہیں، ان کو یہ احساس بھی رہا کہ تہذیبی تعصب ہندوستان میں بھی اتنا ہی ہے جتنا یورپ میں، نظریاتی اعتبار سے وہ کمیونزم سے متاثر رہے لیکن ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹیوں کے کردار پر بھی انہوں نے نکتہ چینی کی، کمیونزم کے زوال میں اقتصادی پالیسیوں سے زیادہ وہ ان کے طریقۂ عمل درآمد کو ذمہ دار مانتے ہیں، انہوں نے مرکزی ایشیا کے ایک سفر میں محسوس کیا کہ غالباً سوویت روس کی پالیسی تھی کہ مسلم ریاستوں کو پس ماندہ ہی رکھا جائے، ان خیالات کے باوجود انہوں نے حج بھی کیا، خانہ کعبہ میں تہجد کی نمازیں ادا کیں اور روحانی آسودگی حاصل کی، اس سفر حج پر بقول ان کے دوستوں اور اغیار نے جملے بازی بھی کی، غرض اس داستان حیات میں ہر رنگ فطری ہے اور اسی وجہ سے یہ سوانح عمری بڑی جاذب اور دل کش ہوگئی ہے، لفاظی اور رنگ آمیزی نے اس کو کہیں بھی مصنوعی نہیں ہونے دیا، البتہ راجیو گاندھی کے ذکر میں یہ کہنا کہ ان کی شخصیت میں اسکندر رومی کی جھلک ملتی تھی شاید فرط جذبات کا اثر ہے، انہوں نے مدۃ العمر انگریزی اور عربی سے زیادہ سروکار رکھا لیکن خودنوشت کے لیے انہوں نے اردو کو منتخب کیا اور اس عطیہ کے لیے وہ جامعہ اسلامیہ کے ممنون ہوئے، ان کے قابل فخر شاگرد پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں بھوپالی ندوی کے قلم سے پیش لفظ ہے جن کی اس دعا پر ہم بھی آمین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سیرت کے سود مند پہلوؤں سے قارئین کو فایدہ اٹھانے کا موقع نصیب فرمائے۔

بوستان ادب: از ڈاکٹر شمیم اختر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۴، قیمت: ۷۵/روپے، پتہ: سی، کے، ۱۴۱/۴۱، ہرہا، وارانسی، یوپی۔

ملا سابق بنارسی، مخلص بنارسی، ملا محمود جون پوری، شیخ فصیح الدین فصیحی جیسے فارسی زبان کے قدیم شعرا وادبا کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، بنارس اور فارسی زبان کے تعلق سے شیخ علی حزیں کا نام سب سے پہلے آتا ہے لیکن اس برہمن آباد میں فارسی زبان سحر واثر کے اور نقوش بھی بڑے گہرے ہیں، لائق مولفہ نے 'احوال وآثار شیخ علی حزیں وشاعری وی' کے نام سے ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھا تھا اور اسی دوران ان کو خیال آیا کہ اسلاف بنارس کے ان آثار کو بھی زندہ کیا جائے جو بے توجہی اور بے التفاتی کے سبب اہل علم کی نظر سے پوشیدہ ہیں، چنانچہ انہوں نے فارسی زبان میں متعدد مضامین لکھے جو مختلف سمیناروں اور رسالوں میں پیش کیے گئے، زیر نظر مجموعے میں ان کو یکجا کردیا گیا ہے، ایک مقالہ بنارس در مثنویات فارسی کے نام سے بھی ہے، پہلا مضمون سابق بنارسی معاصر علی حزیں پر نسبتاً زیادہ مفصل ہے، تحقیق اور محنت اور سلیقے نے ان مقالات کو پر مغز اور مفید بنادیا ہے، خصوصاً دیار شرق میں فارسی کی گرم بازاری کے مشاہدے

کے لیے یہ تحریریں بڑی کارآمد ہیں۔

جزیرہ کی بازیافت: از ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۶، قیمت: ۳۰؍ روپے، پتہ: یونیورسل بک ہاؤس، عبدالقادر مارکیٹ، علی گڑھ۔

ممبئی سے کچھ دور بحیرہ عرب میں جزیرہ جنجیرہ اگرچہ اور دوسرے چھوٹے جزیروں سے مختلف نہیں لیکن اردو ادب میں یہ خاموش اور خوبصورت جزیرہ بعض حیثیتوں سے ممتاز ہی نہیں زندۂ جاوید ہوگیا ہے، باذوق سیاحوں کے لیے اس کے قدرتی مناظر اور چند تاریخی آثار کے علاوہ اور بھی شوق کے محرکات ہیں، ڈاکٹر قاسمی نے ایک تعلیمی سفر کے سلسلے میں اس جزیرہ کی سیر کی اور ان کے تاریخی ذوق اور کھوئے ہوؤں کی جستجو کی آرزو نے روداد سفر کو خوب سے خوب تر بنادیا، مسلمانوں کے اس جزیرہ کی تاریخ کے ہر نقش کو انہوں نے عظمت رفتہ کے نشان کی نظر سے دیکھا، جنجیرہ کی آب و ہوا میں سانسیں لے کر علامہ شبلی و اقبال اور عطیہ فیضی کی یادوں سے غافل رہنا ممکن نہیں، علامہ شبلی کے الفاظ میں "جزیرے کا خواب، بیداری میں بھی نظر آتا ہے" صاحب دل سیاح نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ داستان بھی اس طرح سنائی کہ علامہ شبلی کے معتقدین اور معاندین شاید دونوں یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

مختصر صفحات میں اتنا مکمل سفرنامہ کم دیکھنے میں آتا ہے۔

موج رنگ: از جناب عارف عباسی نورپوری اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد گردپوش، صفحات ۱۳۱، قیمت: ۱۱۰؍ روپے، پتہ: نیو ہورایزن پبلشرز، نئی دہلی - ۶۷۔

جناب عارف عباسی مرحوم بھی اعظم گڈھ کی خاک کے ان ذروں میں تھے جن میں نیر اعظم بننے کی پوری صلاحیت تھی، ۸۸ء میں ان کا انتقال ہوا تو گو ان کی شہرت، عام نہ تھی لیکن ان کے کلام کی خوبی کا اعتراف اہل نظر کو تھا، ان کا یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا لیکن یہ ان کی قادر الکلامی خصوصاً غزل گوئی میں ان کی مشاقی کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ان کو خود یہ احساس تھا کہ صنعت نغمہ سرائی کی یہ مہارت خداداد ہے، ان کی غزلوں میں واردات قلب ایسی بے ساختگی اور سچائی سے ظاہر ہوتے ہیں کہ اثر و تاثیر کی کیفیت خود بخود طاری ہو جاتی ہے، ان کی ساری غزلیں مرصع ہیں، شاید ہی کوئی شعر پست یا کمزور ہو، کلام کی پاکیزگی اور غزل کے رکھ رکھاؤ نے ان کے اشعار کو بڑی رفعت عطا کردی ہے، شروع میں ان کی شخصیت اور کلام پر عمدہ تحریریں بھی آگئی ہیں، اردو شاعری کے باذوق قارئین کے لیے اس مجموعہ میں وافر سامان لطف و نشاط ہے۔

ع - ص

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اسوۂ صحابہؓ (حصہ اول): اس میں صحابہ کرامؓ کے عقاید، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰؍ روپے

اسوۂ صحابہؓ (حصہ دوم): اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت ۵۶؍ روپے

اسوۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰؍ روپے

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ: اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ قیمت ۳۲؍ روپے

امام رازیؒ: امام فخر الدین رازیؒ کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ (زیر طبع)

حکمائے اسلام (حصہ اول): اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت ۵۰؍ روپے

حکمائے اسلام (حصہ دوم): متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۷۰؍ روپے

شعر الہند (حصہ اول): قدما سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ قیمت ۸۰؍ روپے

شعر الہند (حصہ دوم): اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۷۵؍ روپے

تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ قیمت ۱۲۵؍ روپے

انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاپردازانہ ترجمہ۔ قیمت ۵۵؍ روپے

مقالات عبدالسلام: مولانا مرحوم کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۶۰؍ روپے

اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت ۸۵؍ روپے

....